فہرست

مضمون نگارانِ معارف

۱۶۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۲ء تا ماہ جون ۲۰۰۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

مضامین معارف

جلد ۱۷۵

ماہ جنوری ۲۰۰۳ء تا ماہ جون ۲۰۰۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جنوری ۲۰۰۲ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحیؔ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (ہند) ۲۷۶۰۰۱

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپے   فی شمارہ دس روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ   ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیٰی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۹   ماہ شوال المکرم ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۲ء   عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گزشتہ مہینے علامہ شبلیؒ کی تاریخِ وفات کی مناسبت سے ان کے متعلق چند باتیں ارتجالاً نوکِ قلم پر آ گئی تھیں جن کو معارف کے بعض اہل علم و نظر قارئین نے پسند کیا، دراصل علامہ مرحوم کی عظمت اور ان کے گوناگوں کارناموں کو جاننے کے لئے ماضی کے کچھ ورق پلٹنے پڑیں گے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغرب کی سیاسی و تہذیبی بالادستی سے پوری دنیائے اسلام تہہ و بالا ہورہی تھی، مسلم حکومتیں ختم یا نیم جاں ہورہی تھیں اور حکومت چھن جانے کے بعد مسلمان دین و ایمان، عقیدہ و مذہب اور اپنی تہذیب و روایات سے بھی ہاتھ دھونے لگے تھے اور مغرب کے علوم و فنون اور نظر فریب تمدن کی چمک دمک کے سامنے انہیں اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن بے آب و تاب دکھائی دے رہے تھے اور وہ یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جارہے تھے۔ کم و بیش اسی صورتِ حال سے ہندوستان کے مسلمان بھی دوچار تھے، ان کے سروں پر بھی ادبار و فلاکت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہر سمت سے ان پر یلغار ہورہی تھی۔

۱۸۵۷ء کو جو علامہ شبلیؒ کی پیدائش کا سال ہے، ہندوستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے، ملک میں بچھی ہوئی انگریزوں کی سیاسی بساط کو الٹ دینے کے لئے اس سال مرحوم بہادر شاہ ظفر کے پرچم تلے جمع ہوکر ہندوؤں اور مسلمانوں نے منظم بغاوت کی تھی جو ناکام ہوگئی اور ہندوستان کے افق سے مغل سلطنت کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور انگریز پورے ملک پر قابض ہوگئے، اس کے بعد ان کا جذبۂ انتقام اور بھڑک اٹھا اور ملک کے باشندوں پر ان کا جبر و تشدد بہت بڑھ گیا، انہوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اس لئے ان کو زیادہ خطرناک سمجھ کر خاص طور پر اپنے عتاب کا نشانہ بنایا، ان کی جان و مال برباد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کا وجود و تشخص ختم کرنے اور ان کی دینی، تہذیبی اور اخلاقی روایات بھی مٹا دینے کے درپے ہوگئے۔

مگر افسوس ہے کہ عام مسلمانوں میں اس سے کوئی بے چینی اور تشویش نہیں تھی، امراء و خواص عیش و عشرت میں منہمک اور خوابِ غفلت میں مدہوش تھے، رہے علماء تو ان کی اکثریت بے روح مدرسی

تعلیم، فقہی جزئیات کی رد و قدح اور فروعی مسائل میں بحث و مناظرے کا بازار گرم کئے ہوئے تھی، اس وقت تین طرف سے مسلمانوں پر حملے ہورہے تھے، ایک طرف عیسائی مبلغین اور مشنریاں دین کی بنیادیں منہدم کررہی تھیں، دوسری طرف آریہ سماج اور ہندوؤں کی اصلاحی تحریکیں مسلمانوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسلام کے قلعہ میں رخنہ انداز ہورہی تھیں، تیسری طرف سے مستشرقین اسلام کی شان و شوکت زائل کرنے اور دینِ حق کو نَسْیاً مَّنْسِیاً کر دینے کے لئے حملہ آور تھے، اور یہ سب سے خطرناک اور ضرر رساں حملہ تھا، کیونکہ عیسائی مبلغوں اور آریوں کا انداز علمی و معروضی کے بجائے فرسودہ بحث اور مناظرانہ یا الزامی جواب کا تھا اس لئے ان کا مقابلہ آسان تھا، علمائے حق کے ایک گروہ اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے مشنریوں اور آریوں کی شرانگیزی اور فتنہ پردازی کا مقابلہ بڑی کامیابی سے کیا اور ان کے اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے بلکہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے جن مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہونے لگے تھے اور وہ دین سے منحرف اور برگشتہ ہورہے تھے ان میں دینی روح پھونکنے اور انکو عقائد حقہ پر قائم رکھنے کے لئے اسی جماعت کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دینی تعلیم کو فروغ دینے کا سامان کیا۔

مستشرقین عربی زبان کے ماہر اور دینی علوم کے فاضل تھے، یہ علم و تحقیق کی راہ سے سائنٹفک انداز میں اسلام کی تصویر مسخ کررہے تھے، مسلمانوں کی جو کتابیں ناپید تھیں، انہیں تلاش کر کے تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کرتے تھے اور ان میں سے غلط اور غیر معتبر روایات و واقعات کو ڈھونڈ کر اور صحیح و معتبر روایات و واقعات میں تدلیس و ملمع سازی کر کے اسلام اور اسلامی تاریخ کو اس قدر بدنما انداز میں پیش کر رہے تھے کہ خود مسلمانوں کو ان سے نفرت اور گھن ہونے لگی تھی، قرآن مجید، احادیث نبوی اور خود آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کوئی ان کے اعتراض کی زد سے محفوظ نہیں تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ہولناکیوں سے سرسید احمد خاں مرحوم برآمد ہوئے جن کو قوم دوست کا واقعی درد تھا اور انہوں نے بڑے اخلاص سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح و ترقی کے گوناگوں کام کئے جس سے مسلمانوں کا ملک میں وزن و وقار قائم ہوا، انہوں نے سر ولیم میور کا جواب خطبات احمدیہ لکھ کر دیا اور دوسری کتابیں اور مضامین بھی لکھے، ان کے بعض رفقا نے بھی اسلام کے بارے میں یورپ کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کے جواب دیئے۔

مگر سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقائے حالات و رجحانات سے واقف ہونے کے باوجود

اصل اسلامی روح اور دینی حکمت وبصیرت میں کامل اور مذہبی علوم کے ماہر نہ تھے، اس کے علاوہ وہ مغربی افکار وخیالات اور یورپ کے علوم وتہذیب سے مرعوب تھے، ان کے رد وقبول کا معیار مغرب تھا، وہ اپنے زمانے کی طبعی تحقیقات، سائنسی تجربات اور ان کے قیاسی نتائج کو قطعی اور یقینی مان کر مسائل شرعیہ کو ان کے مطابق کرنے لگے اور جب مستشرقین کے اعتراضات کا جواب نہیں بن پڑتا تو اسلامی عقائد وتعلیمات کی نہایت دور از کار تاویل وتوجیہ کرتے تھے۔ اسی طرح کی غلطی پہلے فرقہ باطنیہ کر چکا تھا، دراصل مستشرقین اور فضلائے مغرب کے اعتراضات کا جواب وہ علماء دے سکتے تھے جو دینی علوم کے ماہر، اسلامی تاریخ و روایات سے واقف، اسلام کی اصل روح وحقیقت سے آشنا اور گہری دینی بصیرت رکھنے کے ساتھ جدید مسائل وتحقیقات، نئے فلسفہ وکلام اور عصر حاضر کے افکار ورجحانات سے باخبر ہوں اور جن کو دینی مہارت کے ساتھ علمی وسائنٹفک انداز، تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں سے واقفیت ہو مگر یہ خصوصیات نہ اس وقت کے قدیم علما میں موجود تھیں اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان خوبیوں کا حامل تھا۔

قدرت نے علامہ شبلیؒ کی ذات میں یہ خصوصیات جمع کردی تھیں، انہوں نے قدیم طرز کے علما سے دینی تعلیم حاصل کی تھی لیکن جدید طبقہ کے لوگوں سے بھی ان کا اختلاط تھا اور وہ دونوں طبقوں کے خیالات سے مستفید ہوتے تھے، جہاں اسلامی علوم وافکار اور اسلامی تاریخ پر ان کی وسیع نظر تھی وہاں نئے خیالات ورجحانات اور جدید مسائل وتحقیقات بھی ان کے لئے اجنبی نہیں تھے، ان کے زمانے میں مستشرقین جو اعتراضات شد ومد سے کر رہے تھے وہ ان سے واقف تھے اور ان کے مدلل ومحققانہ جوابات دئے اور اسلام، اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ وتمدن کو ایسے دل نشین انداز میں پیش کیا کہ معترضین بھی ان کی عظمت وجلالت ماننے کے لئے مجبور ہوگئے، مسلمانوں کے گزشتہ شاندار کارنامے بیان کرکے قوم کی افسردگی ومایوسی دور کردی، وہ اپنے پیچھے لایق اور قابل فخر تلامذہ اور دارالمصنفین کو چھوڑ گئے تاکہ نئے زمانے میں اسلام کی نئی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اسی لئے قوم پر دارالمصنفین کے بقا وتحفظ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، مغرب کی زہر چکانیوں اور صلیبیوں کی یلغاروں کا سلسلہ بھی جاری ہے اور قومی پریس اور فسطائیت پسندوں کی مسلسل ہرزہ سرائیوں اور لغویات سے اسلام کی تصویر بدنما ہو رہی ہے اور ہر دردمند دل سے یہ آواز نکل رہی ہے کہ ردة ولا ابابکر لها۔

مقالات

قرآن اور کائنات آیات الٰہی کا مجموعہ

از مولانا محمد شہاب الدین صاحب ندوی ٭

(۳)

جس طرح قرآن حکیم ایک معجزہ ہے اسی طرح یہ کائنات بھی ایک معجزہ ہے۔ ایک تصنیفی معجزہ ہے تو دوسرا تخلیقی معجزہ۔ یعنی انسان جس طرح قرآن جیسی کوئی کتاب تصنیف نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ کائنات یا اس کے مظاہر کی بھی تخلیق نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ ایک مکھی یا مچھر کو بھی پیدا نہیں کرسکتا، جو ادنیٰ درجے کے مظاہر حیات ہیں، اسی وجہ سے مظاہر کائنات یا موجودات عالم کو جس طرح "آیات" سے تعبیر کیا گیا اسی طرح قرآنی آیات کو بھی "آیات" کہا گیا ہے۔ یعنی مظاہر کائنات جس طرح اللہ کی نشانیاں یا وجود باری کے دلائل ہیں اسی طرح قرآن حکیم کی آیات بھی باری تعالیٰ کے وجود کا ثبوت ہیں۔

نوع انسانی کو ایک چیلنج

اسی وجہ سے نوع انسانی کو چیلنج کیا گیا ہے کہ وہ قرآن جیسا کوئی دوسرا کلام گھڑ کر پیش کرے جو اس کا ثانی یا ہم شل ہو، جس طرح کہ اسے للکارا گیا ہے کہ تخلیقات الہیہ جیسی کوئی تخلیق پیش کرکے دکھائے چنانچہ قرآن عظیم کے بارے میں ارشاد ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ   کہدو کہ تمام جن اور انسان بھی اگر جمع

٭ جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۲۹۔

عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۸۸)

ہوجائیں اس جیسے قرآن کی مثال پیش کرنے تو وہ اس جیسا کلام پیش نہیں کرسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (یونس: ۳۸)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے (محمد نے) اس (قرآن) کو گھڑ لیا ہے؟ کہدو کہ (اگر یہ بات ہے تو) تم اس قرآن جیسی کوئی ایک ہی سورت پیش کرو اور اپنی مدد کے لئے اللہ کے سوا جس کو بلاسکو بلالو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

چنانچہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود پوری نوع انسانی مل کر بھی قرآن کا ہم مثل پیش کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس کی کسی ایک ہی سورت جیسی فصیح و بلیغ اور حقائق سے پُر سورت پیش کرنے سے عاجز و بے بس نظر آتی ہے۔ تو کیا یہ کلام الٰہی کا معجزہ نہیں ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی اس جیسا کلام پیش نہیں کرسکتے، بلکہ اس خدائی چیلنج کے مقابلے میں دنیا کے تمام ادیب و انشا پرداز اور فصحاء و بلغاء منکسر و درماندہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس حیثیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کلام برحق اور من جانب اللہ ہے جو کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

انسان کو ایک دوسرا چیلنج جس طرح کلام الٰہی کی مثال پیش کرنے سے پورا عالم انسانی بے بس ہے اسی طرح وہ خدائی تخلیقات جیسی کوئی تخلیق پیش کرنے سے بھی عاجز و درماندہ ہے،

چنانچہ ایک موقع پر مشرکین کے معبودوں کا عجز اور ان کی درماندگی ظاہر کرنے کی غرض سے فرمایا گیا ہے کہ وہ ایک مکھی جیسی حقیر شے کی تخلیق سے بھی عاجز ہیں اور یہ مثال موجودہ دور کے سائنس دانوں پر بھی بخوبی صادق آتی ہے، جن کو آج دنیا "معبودوں" کے مقام پر فائز کرکے گویا کہ انہیں "مختار کل" سمجھتی ہے کہ وہ جو چاہے کرسکتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ۔ (حج: ۷۳)

اے لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب کے سب جمع ہوجائیں۔

ایک اور موقع پر زمین و آسمان کی تخلیق اور قسم ہا قسم کے حیوانات و نباتات کا تذکرہ کرنے کے بعد بطور چیلنج ارشاد ہوتا ہے:

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (لقمان: ۱۱)

یہ اللہ کی تخلیق ہے تو تم مجھے دکھاؤ کہ اس کے ماسوا لوگوں نے کیا پیدا کیا ہے؟

انسان زندگی کی حقیقت سے ناواقف اس کا مطلب یہ ہوا کہ معبودان قدیم یا معبودان جدید نے رب العالمین کی تخلیقات جیسی کوئی چیز پیدا نہیں کی ہے، یعنی وہ مردہ عناصر میں جان نہیں ڈال سکتے اور روئے زمین پر پائے جانے والے لاکھوں قسم کے حیوانات و نباتات میں سے کوئی ایک ادنیٰ قسم کی نوع بھی مٹی سے برآمد نہیں کرسکتے۔ بلکہ وہ خلیہ (سیل) جیسی ایک حقیر چیز بھی وجود میں نہیں لاسکتے جو زندگی کی ایک اکائی (یونٹ) ہے اور جس کے اندر مادۂ حیات

(پروٹوپلازم) بھرا ہوتا ہے اور یہ مادہ حیات پوری دنیائے سائنس کے لئے ایک عجوبہ اور ایک سرِ نہاں ہے جس کی حقیقت و ماہیت سمجھنے سے وہ عاجز و بے بس ہے۔ چنانچہ ماہرین سائنس نے اعتراف کیا ہے کہ زندگی بذات خود ایک پُر اسرار شے اور اسرار کائنات میں سب سے زیادہ حیرت ناک چیز ہے۔

Of all the wonders of the universe, the most striking, perhaps is the life itself.(1)

اس سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ زندگی ایک ایسی مظہر ہے جس کی تعریف کرنا یا اس کے تمام مختلف تصورات کی تشریح کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

Life: A phenomenon almost impossible to define or to explain in all of its varying aspects (2)

ظاہر ہے کہ جب انسان زندگی کی حقیقت سمجھنے ہی سے بے بس و درماندہ ہے تو پھر وہ کسی چیز میں جان یا روح کیسے بھر سکتا ہے؟ غرض انسان تخلیقاتِ الٰہیہ کا مقابلہ کسی بھی حال میں نہیں کر سکتا اور یہ حقیقت موجودہ سائنس کی ہمہ گیر ترقی کے دور میں بھی ایک اٹل صداقت نظر آرہی ہے۔ اسی لئے ایک موقع پر انسان کو خصوصیت کے ساتھ مٹی سے پیدا کئے جانے کو وجود باری کی ایک دلیل قرار دیا گیا ہے:

وَمِنْ اٰيَاتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۔ (روم: ۲۰)

اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تم (پورے) انسان بن کر (روئے زمین پر) پھیل رہے ہو۔

اور یہ حقیقت ایک دوسرے اسلوب میں اس طرح مذکور ہے جو ہر قسم کے شرک (چاہے وہ قدیم قسم کا ہو یا جدید قسم کا جو آج مادیت کے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے) پر بخوبی صادق آتی ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ۔ (فاطر: ۴۰)

کہہ دو کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہارے شرکا جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو انہوں نے زمین سے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں؟ یا سماوی دنیا میں بھی ان کی کوئی ساجھے داری ہے؟

مخلوق کبھی خالق نہیں بن سکتی

واقعہ یہ ہے کہ مخلوق کبھی خالق کے درجے پر فائز نہیں ہو سکتی، خواہ وہ سائنسی و تمدنی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے۔ اس معاملے میں بڑے سے بڑا سائنس دان بھی ایک عام انسان ہی کی طرح ہے اسی لئے فرمایا گیا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔ (یونس: ۳۴)

کہہ دو کہ تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو تخلیق کی ابتدا کر کے اس کا اعادہ کر سکتا ہو؟ کہہ دو کہ اللہ (ہر مخلوق کی) ابتدا کر کے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے (دوبارہ اسے اسی طرح پیدا کرتا ہے) تو تم کہاں بہکے جا رہے ہو؟

تخلیق و آفرینش کے معاملے میں اس پوری کائنات میں ایک ہی خلاق ہستی موجود ہے۔

جس کا کوئی ثانی یا شریک نہیں ہے۔ اسی لئے ارشاد باری ہے:

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْھِمْ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ (رعد: ۱۶)

کیا ان لوگوں نے (اوروں کو) اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جنھوں نے اللہ کی مخلوق جیسی کوئی مخلوق پیدا کر دی ہو، جس کی وجہ سے ان پر التباس ہو گیا ہو؟ کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ (اس پوری کائنات میں) واحد اور زبردست ہے۔ (اور اس باب میں کوئی اس کا ثانی نہیں ہے)

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (اعراف: ۵۴)

آگاہ رہو (مخلوقات کو) پیدا کرنا اور (ان پر) حکم چلانا اسی کو سزاوار ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو سارے جہاں کا رب ہے۔

قرآن حکیم چونکہ ایک ابدی و سرمدی صحیفہ ہے اس لئے اس کے اصول و کلیات ہر دور میں صادق آتے رہتے ہیں اور وہ کبھی از کار رفتہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس کلام حکمت کا نازل کرنے والا ہر دور کے احوال و کوائف سے بخوبی واقف ہے۔ لہٰذا اس کی نظر سے حال یا مستقبل کا کوئی بھی واقعہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ

حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ (نمل: ۶)

آپ کو یہ قرآن حکمت والے اور علم والے (رب) کی جانب سے عطا کیا جا رہا ہے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور کلوننگ کی حقیقت

اس موقع پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے جو محیر العقول کارنامے سامنے آ رہے ہیں ان کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کا انسان جو چاہے کر سکتا ہے اور جو چیز چاہے بنا سکتا ہے چنانچہ آج وہ نہ صرف بحر و بر کو تسخیر کر کے چاند ستاروں پر کمند پھینک رہا ہے بلکہ وہ مصنوعی طور پر انسانی نطفے کو ڈیولوپ کر کے بچے بھی پیدا کر رہا ہے، جسے نلکی زادہ یا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کلوننگ کے ذریعہ کسی زندہ چیز کا ہمزاد (ڈوپلیکیٹ) بھی تیار کر رہا ہے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے ایک بکری پر اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور اب کچھ سائنس داں انسانوں پر بھی اس کا تجربہ کرنے والے ہیں۔ اسی طرح جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعہ بہت سے تجربات کئے جا رہے ہیں جو بعض امراض اور نقائص کو دور کرنے کے سلسلے میں ہیں۔ لہٰذا ان آیات کا مفہوم کس طرح صادق آ سکے گا؟

تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ انسان آج جینیاتی انجینئرنگ یا کلوننگ وغیرہ کے میدان میں جو کچھ بھی "کارنامے" انجام دے رہا ہے وہ خدائی تخلیقات میں پیوند کاری ہے جو اس کی اپنی تخلیقات نہیں ہیں۔ چنانچہ نلکی زادے کا خمیر مرد کا نطفہ اور عورت کا بیضہ ہے جن کو ملا کر نلکی یا ٹیسٹ ٹیوب میں مصنوعی طور پر ڈیولوپ کیا جاتا ہے، جس طرح یہ عمل طبعی طور پر رحم مادر میں ہوتا ہے۔ انسان اس سلسلے میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ ٹیسٹ ٹیوب کو ویسے ہی درجۂ حرارت اور ویسے ہی حالات میں رکھا جاتا ہے جو رحم مادر میں قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ دونوں چیزیں (نطفہ اور بیضہ) چونکہ باری تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اس لئے انسان کو نلکی زادے

کا خالق نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس نے یہ دونوں چیزیں مٹی سے براہ راست برآمد نہیں کی ہیں یا مردہ عناصر میں جان نہیں ڈالی ہے۔ یہی حال کلوننگ کا بھی ہے کہ وہ کسی جاندار چیز کا ایک خلیہ (سیل) حاصل کر کے اس کو مصنوعی طور پر ترقی دیتا ہے اور جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا انسان کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ زندگی بذات خود کیا ہے اور وہ مردہ عناصر میں کس طرح ظہور پذیر ہو جاتی ہے؟ بلکہ وہ روح کو محض ایک کیمیائی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے جب کہ وہ ایک "امر الٰہی" ہے جو خدا کے حکم سے ظہور میں آتی ہے۔ اگر وہ محض کیمیائی عمل کا نتیجہ ہوتی تو انسان کبھی کا "خالق" بن گیا ہوتا۔ کیونکہ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اب تک کسی بھی چیز میں روح بھرنے کے قابل نہ بن سکا ہے۔ لہٰذا وہ خلاقیت کے مرتبے پر کبھی فائز نہیں ہو سکتا۔ اس جہاں کا صرف ایک ہی خالق ہے اور ہمیشہ ایک ہی خالق رہے گا۔

خدائی تخلیقات اور انسانی مصنوعات اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے جو بھی کارنامے ہیں وہ نظام فطرت میں ودیعت شدہ طبیعی قوانین وضوابط کے ماتحت ہیں اور انسان ان قوانین وضوابط کے مطابق ضرور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر وہ ان کے اصولوں کو بدل نہیں سکتا اور مظاہر کائنات کے نظاموں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ بلکہ خلاق عالم نے جس جس چیز کا جو ضابطہ مقرر کر دیا ہے اس میں الٹ پھیر نہیں کر سکتا۔ یا زیادہ صاف لفظوں میں طبیعی وحیاتیاتی قوانین میں ترمیم واضافہ نہیں کر سکتا، جن میں وہ خود بھی بندھا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے انسان آزاد نہیں بلکہ طبیعی قوانین میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے اور ان قوانین وضوابط کی تکمیل کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ مثال کے طور پر انسان، ہوا، پانی اور غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور ان چیزوں کا کوئی بدل ممکن نہیں ہے۔ انسان جو غذا کھاتا ہے وہ مٹی میں موجود عناصر کا مجموعہ ہے جن کو وہ براہ راست مٹی سے اخذ نہیں کر سکتا۔ بلکہ انہیں نباتات کے ذریعہ تیار کردہ "مرکبات" کو اپنی غذا بناتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے "قوانین فطرت" ہیں جن کا وہ پابند ہے۔

غرض خدائی تخلیقات اور انسانی مصنوعات میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ محض صنعت وحرفت (ٹکنالوجی) کے میدان میں کرتا ہے نہ کہ حیاتیات کے میدان میں۔ اور صنعت وحرفت سے متعلق اس کے یہ کارنامے بھی نقاش فطرت کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے تحت ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان سے آزاد ہو کر نہیں۔ اس نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ عوام کو اسی مسئلے میں اشتباہ والتباس ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ سائنسدانوں کو الوہیت کے مرتبے پر فائز قرار دینے لگتے ہیں۔

آج روئے زمین پر سائنسی سروے کے مطابق تقریباً بارہ لاکھ حیوانات ونباتات پائے جاتے ہیں۔ مگر انسان ان انواع حیات میں سے کسی ایک نوع کی بھی تخلیق نہیں کر سکتا اس لئے سائنس داں جو چاہے وہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ بے چارے اس معاملے میں حد درجہ مجبور دکھائی دیتے ہیں نہ کہ آزاد اور مطلق العنان۔ بلکہ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود اپنے نفع ونقصان اور اپنی زندگی اور موت پر بھی قادر نہیں ہیں۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کی سلطنت اور کسی اور کے قلمرو میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَا	انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر چند ایسے
يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ	معبود بنائے ہیں جو کوئی چیز پیدا
وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا	نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود ہی پیدا
وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا	کئے گئے ہیں (لہٰذا ایک مخلوق خالق
حَيَاةً وَلَا نُشُورًا۔	نہیں بن سکتی) بلکہ اس سلسلے میں ان کی
(فرقان: ۳)	کمزوری کا حال یہ ہے کہ) وہ خود اپنے

نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں ہیں۔

(اسی طرح) وہ اپنی موت [illegible]یات اور

دوبارہ جی اٹھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

اس اعتبار سے جب وہ کسی بھی چیز کا اختیار نہیں رکھتے تو وہ خالق کے مرتبے پر کیسے فائز ہوسکتے ہیں؟ خالق تو وہ ہے جو ہر بات پر قادر ہو اور اپنے نفع و نقصان پر قابو رکھتا ہو۔ اسے کوئی بیماری نہ آتی ہو اور کوئی غم نہ ستاتا ہو۔ اسی طرح اپنی زندگی اور موت پر قابو رکھتا ہو۔ مگر ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس پر انسان قدرت رکھتا ہے؟ اگرچہ کہ وہ کتنا ہی بڑا سائنس داں یا انجینیر ہی کیوں نہ ہو؟ اسی لئے قرآن حکیم میں تردید شرک کے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے انسان قوانین قدرت یا ضوابط ربوبیت کا پوری طرح پابند ہے؟ ان سے آزاد نہیں اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کسی بھی حال میں نہیں کرسکتا اور ان قوانین کو نظر انداز کر کے کسی چیز کی "تخلیق" نہیں کرسکتا۔ کیونکہ خلاقیت ایک ایسا راز ربوبیت ہے جس کا علم انسان کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا انسان ہمیشہ ایک انسان ہی رہے گا اور وہ کوئی لمبی "چھلانگ" نہیں لگا سکے گا۔

آیات کتاب اور آیات کائنات خلاصہ یہ کہ جس طرح کلام الٰہی کی مثال پیش کرنے سے پورا عالم انسانی عاجز ہے؟ بالکل اسی طرح خدائی عمل تخلیق کی مثال پیش کرنے سے بھی وہ عاجز و بے بس ہے۔ اسی لئے مظاہر کائنات کو جس طرح "آیات" یعنی اللہ کی نشانیاں کہا گیا ہے اسی طرح قرآنی جملوں کو بھی "آیات" قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ دونوں خدا کے وجود کی دلیل ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ آیت اور آیات کے لفظی معنی اور ان کے مدلولات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ ان کا مقصود واضح ہوسکے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیت

اور آیات کے الفاظ ۳۸۲ مقامات پر لائے گئے ہیں۔ لفظ آیت واحد اور اس کی جمع آیات ہے اور آیت کے لفظی معنی واضح علامت یا واضح نشانی کے ہیں۔ قرآن حکیم میں اس کا اطلاق حسب ذیل مطالب کے لئے کیا گیا ہے:

۱۔ معجزات انبیاء جو ان کی سچائی اور اللہ کی قدرت کی علامت ہیں۔

۲۔ کوئی عبرت یا سبق آموزی کی بات۔

۳۔ موجودات عالم میں پائے جانے والے وہ نشانات جو خدا کی خلاقیت پر دلالت کرنے والے ہوں۔

۴۔ اوامر و نواہی، یعنی احکام القرآن۔

۵۔ قرآنی آیتیں یعنی اس کے جملے۔[۱]

اب بالترتیب ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ معجزات کے معنی میں جیسے:

فَلَمَّا جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى۔ (قصص: ۳۶)	پھر جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی ہوئی نشانیاں (معجزات) لے کر آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو ایک بنایا ہوا جادو ہے
وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (قمر: ۲)	اگر وہ کوئی نشانی (معجزہ) دیکھ لیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہوئے کہنے لگیں گے کہ یہ تو ایک جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

۲۔ نشانات خداوندی یا دلائل ربوبیت جن کو نقاش فطرت نے عالم طبیعی یا عالم ربوبیت میں نوع انسانی کی عبرت و بصیرت کے طور پر رکھ چھوڑے ہیں اور وہ دلیل و استدلال کے لئے

منطقی قضایا کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس عالم ارض وسما کی ہر چیز ایک "آیت" یعنی وجود خداوندی کی دلیل ہے۔ جیسے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ۔ (روم: ۲۰)	اس کے وجود کی نشانیوں میں سے یہ بات کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔
وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔ (روم: ۲۲)	اور اس کی نشانیوں میں سے ہے زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں میں اختلاف رکھ دینا یقیناً ان مظاہر میں اہل علم کے لئے دلائل ربوبیت موجود ہیں۔

۳۔ کوئی عبرت یا سبق آموزی کی بات، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے:

وَلِنَجْعَلَہٗ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ۔ (مریم: ۲۱)	تاکہ ہم اسے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنادیں۔

اور فرعون کے بارے میں ارشاد ہے:

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَۃً۔ (یونس: ۹۲)	تو آج ہم تیرے بدن کو باقی رکھیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے ایک عبرت کی چیز بن سکے۔

۴۔ اوامر و نواہی یعنی احکام القرآن، جیسے:

کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ۔ (بقرہ: ۲۶۶)	اللہ اسی طرح اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ان میں غور کرو۔

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ۔ (آل عمران: ۷۰)	اے کتاب والو تم اللہ کے احکام کا انکار کیوں کرتے ہو جب کہ تم (ان کی حقانیت) پر گواہ ہو۔

۵۔ قرآنی آیات یا اس کے جملے، جیسے:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ۔ (آل عمران: ۷)	وہی ہے جس نے آپ پر یہ کتاب اتاری اس میں بعض آیتیں محکم (واضح) ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور بعض متشابہ (غیر واضح) ہیں۔
ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ (جمعہ: ۲)	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں سے بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔
الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ۔ (یونس: ۱)	الف، لام، را، یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

کتاب تلاوت اور کتاب کائنات ان پانچ مفہومات میں سے اس وقت بحث دوسرے اور پانچویں مفہوم سے ہے۔ یعنی مظاہر کائنات بھی اللہ کی آیات ہیں اور قرآنی آیات بھی اس کی آیات ہیں اور یہ دونوں خدائی معجزات یا دلائل ربوبیت ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک مصری عالم شیخ مصطفےٰ مراغی (ایک سابق شیخ الازہر) نے بعض علماء کا ایک قول اس طرح نقل کیا

ہے کہ: "اللہ کی دو کتابیں ہیں، ان میں سے ایک مخلوق ہے جو کہ کائنات ہے اور دوسری منزل ہے جو کہ قرآن ہے اور وہ ہم کو عقل کے ذریعہ علمی طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لہذا جس نے ان دونوں سے اعراض کیا تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ناکام ہوا۔"[۵]

حاصل یہ کہ صحیفہ فطرت (کائنات) اور صحیفہ تلاوت (قرآن حکیم) دونوں خدائی معجزات اور وجود باری کی دلیل ہیں۔ قرآن حکیم میں جو رموز و اسرار مذکور ہیں ان کی تفصیل نظام کائنات میں موجود ہے اور جو کچھ کائنات اور اس کے مظاہر میں موجود ہے اس کے اصول و کلیات کلام الٰہی میں مرقوم ہیں۔ ان دونوں کی تطبیق سے "معرفت الٰہی" حاصل ہوتی ہے یعنی باری کی ذات گرامی اور اس کی صفات عالیہ و صفات کمالیہ کے بھید کھلتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہر قسم کے بے بنیاد نظریوں اور فلسفوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

لہذا قرآن عظیم پوری نوع انسانی کے لئے تذکیر و انتباہ کا باعث اور نامہ ہدایت ہے، جس سے اعراض کرنا اور اس کے دلائل و براہین کو خاطر میں نہ لانا اس کے لئے نقصان دہ اور اس کی آخرت کی تباہی کا باعث ہے۔ اس کائنات کی تخلیق اور اس میں موت و حیات کا سلسلہ باری تعالیٰ نے ایک بہت بڑے امتحان کی غرض سے جاری کیا ہے۔ لہذا جو اس امتحان میں کامیاب ہوگا وہ اخروی زندگی کی سعادتوں سے متمتع ہوگا اور جو اس میں ناکام رہا وہ عذاب الیم کا مستحق بنے گا۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ

الْغَفُورُ۔ (ملک: ۱-۲)

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں (سارے جہاں کی) بادشاہی ہے (لہذا) وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اسی نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور وہی (سب پر) غالب اور (اس کی طرف رجوع کرنے والوں کو) بخشنے والا ہے۔

بہرحال صحیفہ فطرت اور صحیفہ تلاوت دونوں کے ملاحظے سے خداوند کریم کی حجت اپنے بندوں پر پوری ہو جاتی ہے۔ تو اب جس کو جینا ہو وہ دلیل دیکھ کر جئے اور جسے مرنا ہو وہ دلیل دیکھ کر مر جائے۔ یہاں کوئی کسی پر داروغہ نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ (حدید: ۹)

وہی ہے (تمہارا معبود) جو اپنے بندے پر کھلی ہوئی نشانیاں اتار رہا ہے تاکہ وہ تم کو (کفر و شرک کی) تاریکیوں سے نکال کر نور (ہدایت) کی طرف لا سکے۔ (اس لحاظ سے) اللہ تم پر بہت مہربان اور رحم والا ہے۔

چنانچہ اس نے اپنی حجت اور مہربانی کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے اپنی کتاب حکمت نازل کی ہے تاکہ نوع انسانی کائنات کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر راہ ہدایت گم کر نہ بیٹھے۔

مراجع

[۱] دی نیو بک آف پوپلر سائنس: ۳/۳۰، ۲۷۴، مطبوعہ ۱۹۸۴ء [۲] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۳۱۲/۶ (خورد) مطبوعہ ۱۹۸۴ء [۳] دیکھئے کتاب "ایسموس گائیڈ ٹو سائنس" ۲/، پنگوئن بکس مڈلسیکس انگلینڈ ۱۹۷۸ء [۴] دیکھئے قاموس القرآن، دامغانی، ص ۹۰-۹۱، مطبوعہ دار العلم للملایین بیروت، نیز معجم الفاظ القرآن الکریم ۱/۳-۴-۷، مطبوعہ مصر [۵] تفسیر مراغی ۱/۲۷، مطبوعہ مصر۔

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا سالِ وفات

از جناب فیروز الدین احمد فریدی*

(۲)

(۲) تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ مصنف: طالب ہاشمی صفحہ نمبر: ۱۷۴

''حضرت بابا صاحب نے بہ اختلاف روایت ۷۶ سے ۱۰۷ برس کے درمیان عمر پائی۔ آپ کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں سخت اختلاف ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ۶۶۰ھ۔ سیر الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، اخبار الاخیار اور جواہر فریدی میں شب سہ شنبہ (منگل) ۵ محرم ۶۶۴ھ۔''

۱۱۔ سیر الاولیاء: سوال یہ ہے کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کے سالِ وفات ہونے کی روایت کہاں سے چلی؟ یہی وہ پہلا سوال تھا جو اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا تھا۔ یہ روایت منسوب ہے سید محمد بن مبارک بن احمد کرمانی سے جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک عزیز مرید تھے اور ''امیر خورد کرمانی'' کے نام سے اس لیے مشہور ہیں کیوں کہ ان کے مشہور دادا سید احمد کرمانی فریدالدین مسعود گنج شکر کے ایک عزیز مرید تھے، گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب ہست۔ امیر خورد کرمانی کا سنہ وفات ۷۷۰ھ (مطابق ۶۹-۱۳۶۸ء) بتایا جاتا ہے۔ اس طرح ''سیر الاولیاء'' اب سے ساڑھے چھ صدی قبل آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ ''سیر الاولیاء'' کے دو مصدقہ قلمی نسخے جن پر ان کا سنہ کتابت درج ہے، ان مقامات پر رکھے ہیں:۔

* کھتوال ہاؤس۔ ۵۴۔ اے اسٹریٹ نمبر ۱۵ گلشن فیصل۔ باتھ آئی لینڈ۔ کراچی

نمبر شمار	مقام	سنہ کتابت: ہجری سال	سنہ کتابت: عیسوی سال	ریمارکس
۱۔	ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ کی لائبریری	۱۰۴۰ھ	۱۶۳۰ء	یہ کتابیں گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں کتابت ہوئیں جب ابوالفضل، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، داراشکوہ، شیخ عبدالرحمن چشتی اور مولانا علی اصغر چشتی لکھ رہے تھے۔
۲۔	انڈیا آفس، لندن	۱۰۹۳ھ	۱۶۸۲ء	

''سیر الاولیاء'' کا ایک قلمی نسخہ کراچی کے قومی عجائب خانے میں بھی ہے جس پر اس کا سنہ کتابت درج ہے نہ اس کے صفحات پر نمبر ہیں۔

اب سے ایک صدی قبل، دہلی کے ایک ہندو رئیس ''چرنجی لال'' نے درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک بزرگ سے ''سیر الاولیاء'' کا ایک قدیم قلمی نسخہ حاصل کیا، اس کی طباعت کے لیے دہلی میں ایک پریس قائم کیا اور ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں، تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ''سیر الاولیاء'' کا فارسی ایڈیشن شائع کیا جو آج بھی ''چرنجی لال ایڈیشن'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایڈیشن اب قلمی نسخوں کی طرح نایاب ہے۔ اس کی طباعت کے ۹۳ برس بعد، ۱۹۷۸ء میں، مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے، ''چرنجی لال ایڈیشن''، مطبع معارف، شارع گنج بخش لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ ۱۹۷۸ء کے اس ایڈیشن میں صفحات کی کل تعداد ۶۰۶ ہے، پہلے دس صفحات ''فہرستِ مندرجات اور (چرنجی لال کے یکم مئی ۱۸۸۵ء کے تحریر کردہ) دیباچہ'' پر مشتمل ہیں۔ اس طرح ''سیر الاولیاء'' (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) کے اصل فارسی متن کے صفحات کی تعداد ۵۹۶ ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اس مضمون کے گزشتہ (یا آئندہ) صفحات میں، جن فاضل سوانح نگاروں نے جہاں چرنجی لال (دہلی۔ ۱۸۸۵ء) ایڈیشن کے کسی صفحے کا حوالہ دیا ہے تو وہ لاہور۔ ۱۹۷۸ء ایڈیشن میں دس صفحات آگے ہوگا۔ مثلاً ''سیر الاولیاء'' کے دہلی۔ ۱۸۸۵ء ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۹۱ کا متن، لاہور۔ ۱۹۷۸ء ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۰۱ پر ہوگا۔

۱۹۲۳ء میں چرنجی لال فارسی ایڈیشن (دہلی۔ ۱۸۸۵ء) کا ترجمہ ''اردو میں'' لاہور سے شائع ہوا جو، فارسی ایڈیشن کی طرح، اب نایاب ہے۔ ۵۷ برس بعد ۱۹۸۰ء میں مرکزی اردو بورڈ، ۲۹۹

اہر مال لاہور نے اردو ترجمہ دوبارہ شائع کرایا، ۱۹۷۸ کا فارسی ایڈیشن اور ۱۹۸۰ء کا اردو ترجمہ بھی اب کمیاب ہیں۔

”سیر الاولیاء“ کے مندرجہ بالا دستیاب ایڈیشنوں کی روشنی میں، اب ہم بابا صاحب کے سالِ وفات سے تعلق رکھنے والے وہ چار اقتباسات پیش کرتے ہیں جو اِن میں درج ہیں۔قومی عجائب خانہ کراچی کے ”سیر الاولیاء“ کے قلمی نسخے میں صفحات پر نمبر نہیں ڈالے گئے، اگر ڈالے جاتے تو ان صفحات کے نمبر وہ ہوتے جو ”قومی عجائب خانے کا قلمی نسخہ“ کے عنوان کے تحت، نیچے قوسین میں درج کیے گئے ہیں۔ان اقتباسات کا تعلق چار موضوعات سے ہے:

(۱) جمادی الاولیٰ ۶۶۹ھ کی دعا کے بارے میں

(۲) ماہِ شعبان ۶۶۹ھ کی دعا کے بارے میں

(۳) ماہِ رمضان میں خلافت نامہ ملنے کے بارے میں

(۴) بابا صاحب کے وفات کے بارے میں

نمبر شمار	موضوع	کراچی کے قومی عجائب خانہ کا قلمی نسخہ	چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء)	اردو ترجمہ (لاہور۔۱۹۸۰ء)
(i)	ماہ جمادی الاولیٰ ۶۶۹ھ کی دعا کے بارے میں	(مفروضہ صفحہ نمبر ۱۴۶) سلطان المشائخ بقلمِ مبارک بشتہ است کہ شیخِ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرّہٗ العزیز کاتب را بخوا ند درروزِ ادینہ، بعد از فراغِ نماز، بیست وپنجم ماہِ جمادی الاولی سنہ تسع وستین وستماتہ،لعاب از دہن	(صفحہ نمبر ۱۳۳) سلطان المشائخ بقلمِ مبارک خود بشتہ است کہ شیخِ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرّہٗ العزیز کہ کاتب حروف را بخوا ند درروزِ آدینہ، بعد از فراغِ نماز، بیست و پنجم ماہِ جمادی الاولی سنہ تسع وستین وستماتہ،لعاب از دہن	(صفحہ نمبر ۲۳۵) سلطان المشائخ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرّہٗ العزیز نے کاتب الحروف کو بلایا۔یہ جمعہ کا دن تھا۔نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ۲۵ جمادی الاولی ۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) کو اپنے

نمبر شمار	موضوع	کراچی کے قومی عجائب خانہ کا قلمی نسخہ	چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء)	اردو ترجمہ (لاہور۔۱۹۸۰ء)
		لعاب از دہنِ مبارک دَردہنِ کاتب کرد...... خواجہ گفت دین ودنیا تُرا دادہ اند، ایں جا ہُمہ نیست، بَرو ملکِ ہندوستان گیر، نظرۃ منک یکفی۔	لعاب از دہنِ مبارک دَردہنِ کاتب کرد...... خواجہ گفت دین ودنیا تُرا دادہ اند، ایں جا ہُمہ ایں است، بَرو ملکِ ہند گیر، نظرۃ منک یکفی۔	منہ کا لعاب اس کاتب الحروف کے منہ میں ڈالا... پھر آپ نے فرمایا کہ ہم نے دین ودنیا تجھ کو دے دیں۔اس جگہ لے دے کر یہی ہے۔ہندوستان جا اور اس ملک کو لے۔(ہند پر) تیری ایک نگاہ ہی میرے نزدیک کافی ہے۔
(ii)	ماہِ شعبان ۶۶۹ھ کی دعا کے بارے میں	(مفروضہ صفحہ نمبر ۱۴۶) دَرغُرہ ماہِ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمایۃ آں حضرت شیخ شیوخ العالم باجابت ودد فاتحہ مقرون فرمود از برای آں کہ کاتب دربدرِ خلق نشود۔	(صفحہ نمبر ۱۳۳) درغُرہ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستمایۃ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرّہٗ العزیز التماس نمودہ آمد شیخ شیوخ العالم باجابت ودد فاتحہ مقرون فرمود از برائے آں کہ کاتب در بدرِ خلق نہ گردد۔	(صفحہ نمبر ۲۳۵) یکم شعبان ۶۶۹ھ (۱۲۷۱ء) کو میں نے شیخ شیوخ العالم سے التماس کی۔اس کے لیے آپ نے فاتحہ پڑھ کر قبولیت کی دعا مانگی۔وہ التماس یہ تھی کہ میں دَربدَر نہ ہوں۔
(iii)	ماہِ رمضان میں خلافت نامہ ملنے کے بارے میں	(مفروضہ صفحہ نمبر ۱۴۱) یک روز خواجہ طلبید، سیزدہم ماہِ رمضان سنہ و ستین وستماتہ بود وفرمود کہ کاغذ بیادید، اجازت نامہ بنویسند، کاغذ آوردند،	(صفحہ نمبر ۱۲۶) یک روز خواجہ طلبید، سیزدہم ماہِ رمضان سنہ تسع وستن وستماتہ بود...... د فرمود کہ کاغذ بیادید، اجازت نامہ بنویسند،	(صفحہ نمبر ۲۲۸) ایک دن آپ نے مجھے طلب کیا۔یہ رمضان المبارک کی ۱۳ تاریخ اور سنہ ۶۶۹ھ (۱۲۷۱ء) تھا ....فرمایا کہ کاغذ لاؤ تا کہ

		اجازت نامہ بنشد، بعدہٗ فرمود کہ مولانا جمال الدین رادر ہانسی و قاضی منتجب رادر دہلی بنمائی۔ (مفروضہ صفحات ۱۳-۱۱۲)	کاغذ آوردند، اجازت نامہ بنشد، بعدہٗ فرمود مولانا جمال الدین رادر ہانسی و قاضی منتجب را در دہلی بنمائی۔ (صفحات نمبر ۱۰۱-۱۰۰)	خلافت نامہ لکھا جائے چنانچہ کاغذ لایا گیا اور آپ نے خلافت نامہ لکھا۔ بعد میں ارشاد فرمایا کہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتجب الدین کو دہلی میں یہ خلافت نامہ دکھلا لینا۔ (صفحہ نمبر ۱۹۰)
(۱۷)	باباصاحب کے وفات کے بارے میں	سلطان المشائخ فرمود کہ بجہتِ لحدِ شیخ شیوخ العالم خشتِ خام حاجت شد، چوں موجود نمی شود، درخانہ شیخ شیوخ العالم کہ بخشتِ خام برآوردہ بودند، ازاں خشت فرود آورند تا در لحدِ شیخ خرچ شدہ طیب اللہ مرقدہٗ و جعل حظرہ القدس مثواہ، از سلطان المشائخ پرسیدند کہ عمرِ شیخ شیوخ العالم چند سال بود، فرمودند کہ نود و پنج سال۔	سلطان المشائخ ے فرمود کہ بجہتِ لحدِ شیخِ شیوخ العالم خشتِ خام حاجت شد، چوں موجود نمی شد، درخانہ شیخ شیوخ العالم کہ بخشتِ خام برآوردہ بودند، ازاں درخشت فرود آوردند تا در لحدِ خرچ شدہ طیب اللہ مرقدہٗ وجعل حظرۃ القدس مثواہ، پوشیدہ نماند کہ تولّدِ حضرتِ شیخ الشیوخ فریدالحق والدین مسعود گنج شکر در ۵۶۹، پانصد و شصت ونُہ بود، و وفاتِ حضرتِ ایشاں درشش صد و شصت و چہار بود۔ عمرِ حضرتِ ایشاں نود و پنج باشد واللہ اعلم۔	سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ شیخ شیوخ العالم کی لحد کے لیے کچی اینٹوں کی ضرورت پڑی لیکن وہ موجود نہ تھیں۔ مجبوراً شیخ کے مکان سے کچھ کچی اینٹیں نکال کر لحد میں لگائی گئیں۔ طیب اللہ مرقدہٗ و جعل حظیرۃ القدس مثواہ۔ واضح رہے کہ سنہِ ولادتِ حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدین مسعود گنج شکر ۵۶۹ھ (۷۴-۱۱۷۳ء) اور آپ کی وفات کا سنہ ۶۶۴ھ (۶۶-۱۲۶۵ء تھا۔ آپ کی عمر ۹۵ سال ہوئی۔

مندرجہ بالا چار اقتباسات پر ہمارے چار تبصرے ہیں:

(۱) پہلے اقتباس میں جو جمادی الاولیٰ سے متعلق ہے، قومی عجائب خانے کراچی کے قلمی نسخے اور چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) ایڈیشن میں تقریباً کوئی فرق نہیں۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ دونوں کتابوں میں سنہ ۶۶۹ کا اندراج عربی الفاظ یعنی "تسع وستین وستمائۃ" میں ہے، فارسی الفاظ میں نہیں جو "شش صد وشصت ونُہ" ہوتے۔ اسی طرح دونوں کتابوں میں، باباصاحب کو "شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین" کہا گیا ہے، نہ کہ "شیخ الشیوخ فریدالحق والدین مسعود گنج شکر"۔

(۲) دوسرے اقتباس میں جو ماہِ شعبان سے متعلق ہے، قومی عجائب خانے کے قلمی نسخے میں یا تو ایک پورا فقرہ یعنی "از حضرتِ شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرّہٗ العزیز التماس نمودہ آمد" خذف ہے، یا چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) ایڈیشن میں اس پورے فقرے کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے میں حذف ہے۔ تاہم قومی عجائب خانے کے قلمی نسخے اور چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) ایڈیشن میں اس باب میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ واقعہ ۶۶۹ھ میں ہوا اور دونوں کتابوں میں سنہ ۶۶۹ کا اندراج عربی الفاظ میں ہے، فارسی الفاظ میں نہیں۔ اسی طرح دونوں کتابوں کے اقتباسات میں باباصاحب کو "شیخ شیوخ العالم" کہا گیا ہے۔

(۳) تیسرے اقتباس میں جو ماہِ رمضان سے متعلق ہے، قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے میں "سنہ و ستین وستمائۃ" لکھا ہے جس کا ترجمہ ۶۶۰ھ ہوگا جب کہ چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) ایڈیشن میں متعلقہ سنہ عربی الفاظ میں، حسبِ سابق، ۶۶۹ھ ہی تحریر ہے۔ سیاق و سباق سے یہاں پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومی عجائب خانے کے قلمی نسخے میں گنتی کے ایک عربی لفظ کی کتابت لفظ "سنہ" اور لفظ "و" کے درمیان ہونے سے رہ گئی۔ اس سنہ کا ۶۶۰ھ ہونا تاریخی طور پر غلط ہوگا۔ نوٹ کرنے والی بات یہاں بھی یہی ہے کہ دونوں کتابوں میں سنہِ وفات عربی الفاظ میں ہے، فارسی زبان میں نہیں۔ چھٹا ہوا لفظ کیا ہے؟ یہ تحقیق طلب ہے۔

(۴) چوتھے اقتباس میں جو باباصاحب کے وفات کے بارے میں ہے، مندرجہ ذیل فقرہ قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے میں نہیں ہے:-

''پوشیدہ نماند کہ تولّدِ حضرتِ شیخ الشیوخ فریدالحق والدین مسعود گنج شکر در ۵۶۹، پانصدو شصت ونُہ بود، ووفاتِ حضرتِ ایشاں در شش صد وشصت وچہار بود۔۔۔۔ واللہ اعلم۔''

پہلی بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا فقرے میں، دوسرے اقتباسات سے ہٹ کر، بابا صاحب کے لیے ''مسعود گنج شکر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اور ''شیخ شیوخ العالم'' کی بجائے بھی صرف ''شیخ الشیوخ'' کہا گیا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ اخلاق حسین دہلوی مرحوم نے اٹھایا ہے کہ اس فقرے میں پہلی بار سنہ یا سنین عربی کے بجائے فارسی زبان میں لکھا گیا ہے یا لکھے گئے ہیں ورنہ ''سیر الاولیاء'' میں دوسرے مقامات پر سنین عربی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ تیسرا نکتہ یہ فطری سوال ہے کہ آیا اس بار بھی، حسب سابق، قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے کے کاتب سے مندرجہ بالا فقرے کی کتابت کرنے میں چُوک ہوگئی، یا معاملہ اس کے برعکس ہے اور چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء) ایڈیشن میں یہ فقرہ ''بعد کا اضافہ'' ہے جو ظاہر ہے کہ چرنجی لال (دہلی۔۱۸۸۵ء) ایڈیشن میں بھی اضافے کے طور پر موجود ہوگا اور اس اضافے کی بنیاد ''سیر الاولیاء'' کا وہ قدیم قلمی نسخہ ہوگا جو ''بندۂ ذوالجلال چرنجی لال'' نے، انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں، خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے کسی بزرگ سے حاصل کیا تھا۔

اس فطری سوال کا فطری اور فوری جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص ۶۶۹ھ کے دو مختلف مہینوں میں زندہ بتایا جارہا ہو تو وہ ۶۶۴ھ میں مرحوم کیسے ہوسکتا ہے؟ علاوہ ازیں مندرجہ بالا فقرے میں بعض الفاظ کا چناؤ، جن کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے، ''سیر الاولیاء'' کے دوسرے اقتباسات کے ہم معنی الفاظ سے یکسر مختلف ہے چنانچہ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے کے کاتب سے یہ فقرہ اپنے قلمی نسخے میں کتابت کرنے میں چُوک ہوگئی۔ یہ فقرہ چرنجی لال ایڈیشن کے قدیم قلمی نسخے میں، جو درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء سے حاصل کیا گیا، ''بعد میں کیا گیا اضافہ'' معلوم ہوتا ہے۔ تاہم بات یہاں پر ختم نہیں ہوجاتی۔

ہمیں ابھی اپنے مضمون کے پہلے سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کی روایت کہاں سے چلی؟ اگر یہ فقرہ جو ''پوشیدہ نماند'' سے شروع اور ''واللہ اعلم'' پر ختم ہوتا ہے، ''سیر الاولیاء'' کے اصل مسودے میں نہیں تھا بلکہ ''بعد کا اضافہ'' ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کام اُجرت پر کام کرنے والے کاتب سے تو ہونے سے رہا۔ اچھے سے اچھا کاتب فقرہ چھوڑ تو سکتا ہے، جس کا

مشاہدہ ہم ابھی، اقتباس نمبر (۲) اور (۳) میں، جو ماہ شعبان اور ماہ رمضان کے متعلق تھے، کرچکے ہیں لیکن برے سے برے کاتب سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ یہ اعلان کرکے کہ ''پوشیدہ نہ رہے'' بابا صاحب کا سنہِ ولادت اور سنہِ وفات خود ہی لکھ ڈالے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ''پوشیدہ نہ رہے'' لکھنے کے بعد، اس فقرے کے لکھنے والے نے، اس فقرے کے الفاظ کے ذریعے، بابا صاحب کے سنہِ وفات کے گرد نظر بندی کا ایسا سنگین حصار کھینچ دیا کہ صدیاں بیت گئیں لیکن بابا صاحب کا صحیح سنہِ وفات اب تک نظروں سے ''پوشیدہ'' ہے۔

اب یہ اکیسویں صدی عیسوی میں اس کام کا بیڑا اٹھانے والے کا کام ہے کہ وہ اس حصار کو توڑے اور دریافت کرے کہ یہ اضافہ کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور کیوں کیا؟ مانا کہ تاریخ میں غلط بیانی ہوتی رہی ہے لیکن ہر غلط بیانی کے پیچھے کوئی خود غرضانہ محرک ہوتا ہے۔ یہاں محرک ہی پوشیدہ ہے، خود غرضی تو بعد کی بات ہے۔

غور کرنے والی دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ فقرہ ''سیر الاولیاء'' میں نہیں تھا تو کہاں تھا۔ جہاں سے، سترھویں صدی عیسوی / گیارھویں صدی ہجری میں داراشکوہ، مولانا علی اصغر چشتی اور (غالبًا) شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتابوں میں ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کے سنہِ وفات کے طور پر لکھ دیا۔ یہ گتھی سلجھانے کے لیے ''سیر الاولیاء'' کے ان قدیم قلمی نسخوں سے مدد مل سکتی ہے جو کلکتے یا لندن میں ہیں اور جن کے بارے میں کبھی کبھی قدسی مقال علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

اور کبھی غالب کا یہ شعر، ایک نئے مفہوم سے، یاد آتا ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

''سیر الاولیاء'' پر اپنا تبصرہ، ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کی اس تحریر سے ختم کریں گے جو ماہنامہ ''منادی'' دہلی کے ''حضرت بابا فرید نمبر'' (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر ۱۴۵ پر ہے۔ اپنے مضمون ''راحت القلوب۔ ایک تنقیدی جائزہ'' میں، پروفیسر صاحب نے چرنجی لال (دہلی۔۱۸۸۵ء) ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے، خواجہ نظام الدین اولیاء سے یہ بیان منسوب کیا ہے، جو ہم پہلے بھی نقل کرچکے ہیں:۔

''شیخ سعدالدین حمویہ نے ۶۵۵ھ میں انتقال کیا ہے۔ اس کے تین سال بعد ۶۵۸ھ میں شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات ہوئی۔ اور ان کے تین سال بعد ۶۶۱ھ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا وصال ہوا۔ اور ان سے تین سال بعد شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا ہے۔ (سیر الاولیاء:۹۱)''

مندرجہ بالا اقتباس میں جو ''سیر الاولیاء'' (چرنجی لال ایڈیشن۔ دہلی۔ ۱۸۸۵ء۔ صفحہ نمبر ۹۱) کے حوالے سے دیا گیا ہے، وہ نہ ''سیر الاولیاء'' کے اس قلمی نسخے سے مطابقت رکھتا ہے جو قومی عجائب خانے کراچی میں رکھا ہے، نہ ''سیر الاولیاء'' کے اس فارسی متن سے جو ۱۹۷۸ء میں لاہور سے مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان اسلام آباد نے شائع کیا اور جو چرنجی لال۔ دہلی ایڈیشن۔ ۱۸۸۵ء پر مبنی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں، مرکزی اردو بورڈ نے ''سیر الاولیاء'' کا جو اردو ترجمہ لاہور سے شائع کیا، اس میں بھی سنین وفات کا ذکر نہیں۔ ایک تقابلی جائزہ نیچے پیش ہے:۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کا سیر الاولیاء سے اقتباس	قومی عجائب خانے کراچی کے قلمی نسخے سے اقتباس (مفروضہ صفحہ: ۱۱۳)	سیر الاولیاء (فارسی) لاہور۔ ۱۹۷۸ سے اقتباس: (صفحہ:۱۰۱)	سیر الاولیاء (اردو) لاہور۔ ۱۹۸۰ء سے اقتباس (صفحہ:۱۹۱)
شیخ سعدالدین حمویہ نے ۶۵۵ھ میں انتقال کیا ہے۔ اس کے تین سال بعد ۶۵۸ھ میں شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات ہوئی۔ اور ان کے تین سال بعد ۶۶۱ھ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا وصال ہوا۔ اور ان سے تین سال بعد شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا ہے۔ (سیر الاولیاء:۹۱)	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعدالدین حمویہ نقل کرد، بعد از دو سہِ سال سیف الدین باخرزی، بعد از دو سہِ سال شیخ بہاء الدین زکریا، بعد از دو سہِ سال شیخ الشیوخ العالم فریدالدین ارواحہم۔	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعدالدین حمویہ نقل کرد، و بعد از دو سہِ سال شیخ سیف الدین باخرزی، بعد از دو سہِ سال شیخ بہاء الدین زکریا، بعد از دو سہِ سال شیخ الشیوخ العالم فریدالدین قدس اللہ سرّہٗ العزیز۔	سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ پہلے شیخ سعدالدین حمویہ نے وفات پائی اور ان کے تین سال بعد شیخ سیف الدین باخرزی نے۔ ان کے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریا نے۔ ان کے تین سال بعد شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرّہٗ العزیز نے وفات پائی۔

یہیں یہ بھی ذکر ہوجائے کہ ایک اور فاضل مصنف سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی کتاب ''بزم صوفیہ'' کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر، ''سیر الاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وفات ۶۶۷ھ تحریر کیا ہے۔ اس پر تبصرہ مضمون کے چوتھے حصے میں کیا گیا ہے۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ اُن فارسی (قلمی اور مطبوعہ) اور اردو نسخوں میں جو ہمارے سامنے ہیں اس اقتباس میں، کسی ولی اللہ کا سنہِ وفات درج نہیں، صرف تین تین برس کا وقفہ بتایا گیا ہے۔ تاہم ''سیر الاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے، دو فاضل مصنفین سنین وفات درج کرتے ہیں جو تحقیق طلب امر ہے۔

ہم نے چند صفحات پہلے ''سیر الاولیاء'' کے مختلف نسخوں سے چار اقتباسات نقل کیے تھے اور بالائی سطور میں پانچواں اقتباس دیا ہے۔ ان اقتباسات سے چار اُمور واضح ہوتے ہیں۔ اولاً ''سیر الاولیاء'' کے جو نسخے آج ہم پڑھ رہے ہیں، خواہ وہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، ان میں باباصاحب کے سنہِ وفات کے بارے میں اختلاف ہے جس کی تازہ ترین مثال پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کا ''سیر الاولیاء'' سے اَخذ کردہ مندرجہ بالا اقتباس ہے جس میں چار اولیائے کرام کے سنین وفات دیئے گئے ہیں۔ پروفیسر صاحب جیسی علمی فضیلت کی حامل شخصیت سے یہ توقع تو نہیں ہوسکتی کہ وہ چرنجی لال دہلی۔ ۱۸۸۵ء ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۹۱ کا حوالہ درج کرنے کے بعد، صفحہ نمبر ۹۱ پر چھپے ہوئے اس متن میں، اپنی طرف سے، ہر ولی اللہ کے وصال کے ذکر کے ساتھ، ایک ایک سنہِ وفات کا اضافہ کردیں گے۔ دوسری طرف یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پروفیسر صاحب کے اس مضمون اور دیگر مضامین کے ستمبر ۱۹۷۴ء کے ماہنامہ ''منادی'' دہلی میں شائع ہونے کے چار برس بعد، ۱۹۷۸ء میں لاہور سے، سیر الاولیاء کا جو فارسی ایڈیشن، اور چھے برس بعد، ۱۹۸۰ء میں جو اردو ترجمہ شائع ہوا، اُن میں متعلقہ اقتباس میں سنینِ وفات کا کہیں ذکر نہیں۔ اب یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ہم ''سیر الاولیاء'' کے کس نسخے کو، کس حد تک صحیح مانیں۔ یاد رہے کہ ابھی ان اقتباسات کا ''سیر الاولیاء'' کے ان قدیم قلمی نسخوں سے تقابل کا کام باقی ہے جو کلکتے اور لندن میں ہیں اور جن کی کتابت گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ یہ وہی صدی ہے جب (غالباً) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، دارا شکوہ اور مولانا علی اصغر چشتی باباصاحب کا سنہِ وفات ۶۶۴ھ لکھ رہے تھے اور ابوالفضل اور شیخ عبدالرحمن چشتی

۶۶۸ھ بتا رہے تھے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے ماہنامہ ''منادی'' دہلی کے ''حضرت بابا فرید نمبر'' (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر ۱۹۵ کے حاشیے میں، اپنے ایک مضمون ''درِ نظامیہ'' میں لکھا ہے کہ ''سیر الاولیاء میں بعض سَن (سنین) صریحاً غلط ہیں''۔ یہاں یہ ذکر برمحل ہوگا کہ ''سیر الاولیاء'' میں درج بعض بیانات بھی تاریخی حقائق پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً ''سیر الاولیاء'' کے اس بیان کو لیجیے جو اس کے فارسی ایڈیشن (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) کے صفحات نمبر ۶۸ اور ۶۹ پر درج ہے اور باباصاحب کے اَجداد اور ان کی کابل سے ہندوستان کے لیے ہجرت کے بارے میں ہے۔ فارسی متن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''اہل ایمان کا یہ بادشاہ (باباصاحب) کابل کے بادشاہ فرخ شاہ عادل کے خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دور میں دنیا بھر کے ممالک کی حکومت فرخ شاہ کے ہاتھوں میں تھی اور تمام ممالک کے بادشاہ فرخ شاہ کے مطیع تھے۔ کابل کی سلطنت غزنی کی سلطنت سے بڑی تھی۔ جب سلطنتِ کابل حوادثِ زمانہ کی زد میں آکر زوال پذیر ہوئی تو وہ شاہانِ غزنی کے ہاتھوں میں آگئی تاہم فرخ شاہ کی اولاد کابل میں آباد رہی حتےٰ کہ چنگیز خاں کا خروج ہوا جس نے پہلے ایران اور ترکستان کو تباہ و برباد کیا اور پھر سلطنتِ غزنی پر لشکر کشی کی اور کابل کو بھی فتح کرکے تباہ کرڈالا۔ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کے جدِ بزرگوار نے کفار سے جنگ میں شہادت پائی۔ اس کے بعد شیخ شیوخ العالم کے جدِ بزرگوار قاضی شعیب اپنے تین بیٹوں۔۔۔ کے ساتھ لاہور کے علاقے میں آگئے اور قسور کے قصبے میں قیام پذیر ہوگئے۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خاں غالباً ۵۵۷ھ مطابق ۱۱۶۲ء میں پیدا ہوا، اور ۶۲۴ھ مطابق ۱۲۲۷ء میں فوت ہوا، اور اس نے ۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۱ء میں کابل پر حملہ کیا اور اُسی صوبے ''بامیان'' میں بدھ مت کا مرکز تباہ کیا جو، ۲۰۰۱ء میں، طالبان حکومت کے ہاتھوں مہاتما بدھ کے چٹانوں میں تراشے ہوئے عظیم الجثہ مجسموں کو تباہ کرنے کی وجہ سے دوبارہ مشہور ہوا۔ باباصاحب کی پیدائش ۵۷۳ھ مطابق ۱۱۷۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ جب چنگیز خاں نے کابل پر حملہ کیا تو باباصاحب تقریباً ۴۴، ۴۵ سال کے تھے اور ہندوستان میں تھے۔ باباصاحب کے والد اور دادا کبھی کے انتقال کر چکے تھے۔ ''سیر الاولیاء'' کا یہ بیان درست نہیں کہ باباصاحب کے پَردادا یا سکڑدادا نے چنگیز خاں سے

جنگ میں شہادت پائی۔ اسی طرح ''سیر الاولیاء'' کا یہ بیان کہ اس دور میں دنیا کے سب ممالک فرخ شاہ کے مطیع تھے، نہ صرف مبالغے کی بنا پر غلط ہے بلکہ اس وجہ سے بھی غلط ہے کہ اُس دور میں اگر کہیں کا کوئی بادشاہ ایسی وسیع و عریض سلطنت کا حکمراں ہوتا تو تاریخ میں سکندر کی طرح مشہور ہوتا، جب کہ تاریخ میں فرخ شاہ نام کے کسی شاہِ کابل کا ذکر نہیں ملتا۔

ان تبصروں کی روشنی میں، ''سیر الاولیاء'' کے کسی نسخے کو، خواہ وہ فارسی میں ہو یا اردو میں، قلمی ہو یا مطبوعہ، عجائب خانے میں ہو یا کتب خانے میں، باباصاحب کے سالِ وفات کے بارے میں واحد اور قطعی ثبوت کے طور پر پیش کرنا محتاط اور معروضی عمل نہ ہوگا، جب تک کہ اس کی خارجی اور معتبر شواہد سے تائید اور تصدیق نہ ہو جائے۔ اگر باباصاحب کے سالِ وفات کا مسئلہ ''سیر الاولیاء'' کے اُن نسخوں سے سلجھ سکتا جن پر محققین اور مؤرخین نے اب تک انحصار کیا ہے، تو مسئلہ کبھی نہ الجھتا اور الجھتا تو سلجھ چکا ہوتا۔ یہ اُلجھاؤ ''سیر الاولیاء'' کی موجودگی میں، بلکہ اُس کی وجہ سے، رہا ہے۔ جب ایک چراغ سے راہ نظر نہ آئے تو دوسرا چراغ جلانے میں حرج نہیں۔

دوسرا حصہ | اس میں اس پر بحث کی جائے گی کہ کیا باباصاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ صحیح ہے اگر نہیں تو کیوں؟

اس کا فوری اور مختصر جواب اس مضمون کے پہلے حصے کے آخری پیرے میں دیا جاچکا ہے۔ اس جواب کی تشریح کے لیے مناسب ہوگا کہ جن مصنفین اور محققین نے ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کو باباصاحب کا سالِ وفات قرار دیا ہے یا سالِ وفات کے طور پر لکھا ہے، ان کی عالمانہ نگارشات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالیں۔ جب نظر ناقدانہ ہو تو بعض اوقات اور مقامات پر تنقید ناگزیر ہو جاتی ہے جو قابلِ مذمت نہیں۔

۱۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتاب سے چار فقرے اس مضمون کے پہلے حصے میں درج کیے گئے تھے۔ اُس کتاب کے صفحہ نمبر ۷۵ پر، پروفیسر صاحب نے، ''سیر الاولیاء'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ میں شیخ نظام الدین، آخری بار، اپنے پیر و مرشد سے ملنے اجودھن گئے، رمضان ۶۶۴ھ میں باباصاحب نے شیخ نظام الدین کو خلافت نامہ عطا فرمایا، اور اس سے قبل اپنی کتاب کے

صفحہ نمبر ۵۶ پر لکھا ہے کہ پانچ محرم ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کا انتقال ہوا۔ محرم قمری سال کا پہلا، جمادی الاولی پانچواں اور رمضان نواں مہینا ہوتا ہے۔ اگر بابا صاحب نے ۶۶۴ھ کے نویں مہینے یعنی رمضان میں خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا کیا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بابا صاحب نے، نو مہینے پہلے، ۶۶۴ھ کے پہلے مہینے یعنی محرم میں رحلت فرمائی ہو؟

اگر بابا صاحب کی ذات، زندگی اور زمانے پر، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی لکھی ہوئی معرکۃ الآرا کتاب روایتی سیرت نگاری ہوتی تو اس پر ہمارا محتاط تبصرہ وہی ہوتا جو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے، اپنی کتاب میں، روایتی سیرت نگاری کی بعض غیر محتاط کتابوں پر کیا ہے، لیکن پروفیسر صاحب مرحوم نے اپنی اس عالمانہ اور محققانہ تصنیف میں بابا صاحب اور سلسلۂ چشت کے دوسرے صوفیائے عظام سے منسوب گھڑی ہوئی ملفوظات، جعلی تصنیفات اور بے سند روایات کا جس طرح بھانڈا پھوڑا ہے اور اپنی کتاب میں درج شدہ کوائف اور سنین کی تصدیق و تائید میں جس طرح ہر جگہ، حاشیوں میں، ماخذ کے حوالے دیئے ہیں، اس کے پس منظر میں، اور پروفیسر صاحب مرحوم کے مسلمہ علمی مقام کے پیش نظر، مندرجہ بالا بدیہی متضاد اور ناممکن تاریخوں کا ان کتاب میں جمع ہو جانا عجیب سا لگتا ہے۔ واضح رہے کہ کم از کم ۱۹۹۱ء تک پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم اپنے اس موقف پر قائم تھے کہ بابا صاحب کا سال وفات ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء ہے اور اپنی انگریزی تصنیف "The Life and Times of Shaikh Nizamuddin Auliya" کے صفحہ نمبر ۱۴ کے حاشیے نمبر ۸ میں لکھا ہے کہ بابا صاحب نے ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء کو وفات پائی۔ یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔

بابا صاحب کی ذات، زندگی اور عہد پر، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی اس معرکۃ الآرا محققانہ تصنیف میں، تحقیق کی یہ واحد واضح لغزش نہیں۔ اس طرح کی دو غلطیاں، اس کتاب کے صفحات نمبر ۱۲۳ اور ۱۲۴ پر بھی نظر آتی ہیں۔ اول الذکر کتاب کا ضمیمہ "د" یعنی "D" ہے۔ اس ضمیمے میں، بابا صاحب کے سجادہ نشینوں کی فہرست دی گئی ہے جس میں دو قسم کی غلطیاں ہیں۔ اولاً فہرست میں درج شدہ سجادہ نشینوں کی تعداد غلط ہے۔ ضمیمے میں صرف "پچیس (۲۵) سجادہ نشینوں کے نام ہیں حالاں کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی اس کتاب کی تصنیف کے وقت، یعنی ۱۹۵۳ء میں، اٹھائیس (۲۸) سجادہ نشین ہو چکے تھے اور اٹھائیسویں سجادہ نشین ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء سے، یعنی ان کی کتاب کے سال

تصنیف سے اٹھارہ انیس برس پہلے سے، گدی نشین تھے۔ ثانیاً ضمیمے میں نام غلط یا نامکمل ہیں۔ مثلاً نمبر شمار ۲۵ پر، پچیسویں سجادہ نشین کا نام (جو اس ضمیمے کے مطابق آخری سجادہ نشین ہیں) شیخ شرف الدین لکھا گیا ہے جو پیر فتح محمد ہونا چاہئے تھا۔ کم از کم چار جگہ، سجادہ نشینوں کے نام نامکمل ہیں، مثلاً تین جگہ، یعنی نمبر شمار ۸، ۱۱ اور ۱۶ پر، سجادہ نشینوں کا نام صرف "شیخ محمد" لکھا گیا ہے جب کہ ان کے نام نمبر شمار ۸ پر شیخ محمد یونس، نمبر شمار ۱۱ پر شیخ محمد شہاب الدین اور نمبر شمار ۱۶ پر شیخ محمد حامد ہونے چاہئے تھے۔ اسی طرح نمبر شمار ۹ پر، سجادہ نشین کا نام صرف "شیخ احمد" لکھا گیا ہے جب کہ پورا نام شیخ محمد احمد شاہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس ضمیمے/فہرست کا ماخذ نہیں لکھا جس سے قدرتی طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہ ضمیمہ/فہرست اپنی ذاتی معلومات اور تحقیق کی بنا پر مرتب کیا۔ اگر یہ مفروضہ درست ہے تو ضمیمے میں پائی جانے والی غلطیوں کی نوعیت اور تعداد کے پیش نظر، ان غلطیوں کی ذمے داری کاتب یا پروف پڑھنے والے پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ واضح رہے کہ اس فہرست کے مندرجات کی تصدیق بآسانی پاک پتن سے کی، یا کروائی جا سکتی تھی۔ افسوس کہ یہ کی گئی نہ کرائی گئی۔

صفحہ نمبر ۱۲۴ ضمیمہ "ہ" یعنی "E" ہے جو باب جنت کے بارے میں ہے۔ بابا صاحب کی خواب گاہ کے جنوب میں واقع پونے چھ فٹ اونچا اور ڈھائی فٹ چوڑا یہ دروازہ صدیوں سے برصغیر پاک و ہند میں ایسی شہرت کا حامل رہا ہے جو آج تک دنیا بھر میں کسی اور دروازے کو نصیب نہ ہو سکی۔ پروفیسر صاحب نے ضمیمہ "ہ" یعنی "E" کا عنوان "بہشتی دروازہ" دے کر، اس قدیم اور تاریخی دروازے کے بارے میں ذکر کے لئے، کیپٹن ویڈ (Captain Wade) نامی ایک جونیئر انگریز افسر کا انتخاب کیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا، اور جس کی غلطیوں سے بھری یہ تحریر کوئی پونے دو صدی پہلے، ۱۸۳۷ء میں، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کے قدیم مجلے میں شائع ہوئی۔ خدا جانے "باب جنت" کے بیان کے لیے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے اتنی پرانی تحریر اور اتنے جونیئر غیر مسلم افسر کا انتخاب کیوں کیا جب کہ وہ تحریر اغلاط سے بھی پر ہے۔ ضمیمہ "ہ" کے پہلے فقرے کا رواں اردو ترجمہ ہے:۔

"جس کمرے میں بابا صاحب مدفون ہیں، اس کے دو دروازے ہیں۔ ایک شمال اور دوسرا مشرق میں۔ مشرقی دروازے کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔"

پروفیسر نظامی صاحب کی کتاب کے مترجم قاضی محمد حفیظ اللہ نے، جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا

ہے، اپنے ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۴۱ پر، اس ضمیمے کا ترجمہ دینے کے بعد، یہ حاشیہ لکھا ہے:

"یہاں مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔ مزار کے دو دروازے ہیں۔ ایک مشرق کو جو مزار کا اصل دروازہ ہے اور ایک جنوب کو جس کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔"

ایک معلم، مؤرخ، محقق اور بابا صاحب کے خاندان سے نسبت رکھنے والا عقیدت مند سے یہ توقع غالباً بے جا نہ ہوگی کہ وہ بابا صاحب کے مزار پر، کم از کم ایک بار، حاضری دیتا، خصوصاً جب کہ وہ بابا صاحب پر ایک محققانہ کتاب لکھ رہا ہو۔ موجودہ دَور میں علی گڑھ سے پاک پتن پہنچنا کون سا مشکل کام ہے؟ اگر پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، تحقیق کے ناطے ہی، ایک بار پاک پتن آتے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جونیئر انگریز افسر کی پرانی اور غلط تحریر کو اتنی اہمیت دیتے کہ اسے حوالے کے طور پر، بلا تصحیح و تبصرہ، اپنی محققانہ کتاب میں شامل کر لیتے۔ اس انگریز افسر نے دو دروازوں کا ذکر کیا ہے اور اتفاق سے دونوں کا ہی ذکر غلط کیا ہے جو صدیوں سے موجود زمینی حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ بابا صاحب کی خواب گاہ کے شمال میں کوئی دروازہ نہیں بلکہ دیوار ہے جس میں خواتین کے لیے جالیاں بنائی گئی ہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے مشرقی دروازے کو بہشتی دروازہ قرار دیا ہے جب کہ جنوبی دروازہ "باب جنت" کہلاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی محققانہ اور ناقدانہ نظر زمانہ قدیم کی مشہور کتب کی غلط بیانیوں اور بے سروپا روایات پر تو پڑی جو مسلم سیرت نگاروں اور خوش عقیدہ مریدوں سے صدیوں سے منسوب چلی آ رہی تھیں لیکن جب انہوں نے "Journal of the Asiatic Society of Bengal" کا نام پڑھا اور اس میں ۱۸۳۷ء کی یہ تحریر اُن کی نظر سے گزری تو انہوں نے ایک مؤرخ اور محقق کے طور پر، اس تحریر کی صحت کے بارے میں تحقیق کی وہ ضرورت محسوس نہ کی جو وہ مسلمان علماء اور راویوں کی قدیم تحریروں کے بارے میں بجا طور پر، کرتے آئے تھے۔ واضح رہے کہ یہاں کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ دروازہ موجود تھا، صرف اسے خود دیکھنے کی ضرورت تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اس بات کا ذکر بھی ہو جائے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب کے مترجم قاضی حفیظ اللہ نے باب جنت کے بارے میں، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی کی کتاب میں پائی جانے والی غلطی کی نشان دہی تو اپنے اردو ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۴۱ کے حاشیے

کے ذریعے کر دی لیکن بابا صاحب کے سال وفات کے بارے میں، "سیر الاولیاء" کے حوالے سے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کے قلم سے جو واضح تضادات ان کی انگریزی کی کتاب میں پائے جاتے تھے، اور جن کی نشان دہی اوپر کی گئی ہے۔ ان پر فاضل مترجم کی بھی نظر نہ پڑی، ورنہ وہ اپنے ترجمے میں، اس سہو کی نشان دہی بھی ایک حاشیے کے ذریعے کر دیتے۔

۲۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کے دفاع میں غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بابا صاحب کی زندگی اور عہد پر کتاب لکھ رہے تھے اور بابا صاحب کا سالِ وفات ان کی تحریر یا توجہ کا مرکز نہیں تھا لیکن یہ بات پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے فاضل استاد اور صدر بھی رہے، بابا صاحب کے خانوادے سے ہیں، بابا صاحب اور سلسلۂ چشت کے بزرگان کے عقیدت مند ہیں اور ان پر قابل قدر تحقیقی کام کر چکے، اور کر رہے ہیں، ستمبر ۱۹۷۴ء میں، ماہنامہ "منادی" دہلی میں شائع شدہ اپنے چار مختلف مضامین میں، کم از کم نو (۹) مختلف مقامات پر، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی صاحب نے بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) قرار دیا۔ دو مقامات یعنی ماہنامہ "منادی" کے صفحہ نمبر ۱۸۱ اور ۱۹۵ پر تو انہوں نے اپنی حتمی رائے کا آغاز یہ کہہ کر کیا کہ "ہمیں معلوم ہے" کہ بابا صاحب نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ اپنے مضامین میں، مثلاً ماہنامہ "منادی" دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر ۲۰۳ کے حاشیے پر، انہوں نے "سیر الاولیاء" کے اس بیان کو غلط قرار دیا کہ بابا صاحب ۶۶۹ھ میں زندہ تھے۔

چودہ برس بعد، فروری ۱۹۸۹ء میں، جب پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے خواجہ حسن نظامی ثانی دہلوی کے "فوائد الفواد" کے اردو ترجمے پر ایک سَو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی مقدمہ لکھا تو اس کے صفحہ نمبر ۸۰ پر لکھا:

"حضرت بابا صاحب کا انتقال پانچ محرم ۶۷۰ھ / تیرہ اگست ۱۲۷۱ء کو ہوا۔"

اس کے دس برس بعد، کراچی کے رسالے "جہانِ چشت" کے اکتوبر ۱۹۹۹ء کے شمارے کے صفحہ نمبر ۴۲ پر، پروفیسر صاحب نے پھر یہ لکھا:

"بابا صاحب کا وصال پانچ محرم ۶۷۰ھ کو ہوا اور اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی۔"

(ماہنامہ "جہانِ چشت" ۔ Sector 15 A/ 1-R-۸۵۹ ۔ بفرزون ۔ کراچی)

پروفیسر صاحب اگر ستمبر ۱۹۷۴ء میں، دوبار، یہ نہ لکھتے کہ "ہمیں معلوم ہے"۔ تو اچھا کرتے۔ علم بعض اوقات حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔ یہ قول "فوائد الفواد" میں ہی درج ہے اور پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی کے "فوائد الفواد" کے اردو ترجمے کے صفحہ نمبر ۷۰ پر، اپنے ۱۱۰ صفحات پر محیط عالمانہ مقدمے میں، اس قول کا ذکر خود کیا ہے۔

۳۔ مولانا نور احمد خان فریدی کے بارے میں ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ یہاں بھی ایک فاضل معلم اور مؤرخ نے بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں تحقیق کی، نہ اسے خصوصی توجہ دی ورنہ ان کی کتاب میں یہ کبھی نہ لکھا ہوتا کہ بابا صاحب کی تاریخِ وفات "نو اکتوبر ۶۶۴ھ" بمطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء تھی۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف مؤرخین، محققین اور سیرت نگاروں میں صرف پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں خصوصی توجہ دی اور اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا۔ ستمبر ۱۹۷۴ء تک پروفیسر صاحب، اپنی معلومات اور تحقیق کی بنا پر، اصرار کرتے رہے کہ انہیں "معلوم" ہے کہ بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء ہے۔ تاہم ستمبر ۱۹۷۴ء اور فروری ۱۹۸۹ء کے درمیان، پروفیسر صاحب کی مزید معلومات اور تحقیق کی روشنی میں، جس کی تفصیلات ہمارے علم میں نہیں، انہیں معلوم ہوا کہ بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۷۰ھ مطابق ۱۲۷۱ء ہے۔ دوسرے مؤرخین، محققین اور سیرت نگاروں نے بابا صاحب کے سالِ وفات پر خصوصی توجہ نہ دی، یا بابا صاحب کا سالِ وفات درج کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا جس کی وجہ سے ان کی کتابوں میں، بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں، ایسے واضح تضادات پائے جاتے ہیں جس کی بنا پر ان کا درج کردہ سالِ وفات بابا فرید نہ صرف مشتبہ بلکہ غلط لگتا ہے؟ کیوں غلط لگتا ہے؟ اس کا جواب مضمون کے بقیہ حصے میں ہے۔

ہماری نظر سے بابا صاحب کی کوئی سوانحِ حیات یا ان کے بارے میں لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں یہ لکھا ہو کہ بابا صاحب کا انتقال غیاث الدین بلبن کے سلطانِ دہلی بننے سے پہلے ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس، اس عہد کی مشہور اور مستند تاریخ میں جو ضیاء الدین برنی نے لکھی اور "تاریخِ فیروز شاہی" کہلاتی ہے، یہ صراحتاً تحریر ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے ابتدائی دور میں بابا صاحب زندہ تھے۔ دوسری کتاب (مرآۃ الاسرار) میں یہ لکھا ہے کہ بابا صاحب کی وفات سلطان

غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔ واضح رہے کہ بلبن ۱۲۶۶ء میں سلطان بنا۔ یکم جنوری ۱۲۶۶ء کو ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ تھا۔ ڈاکٹر منظور ممتاز نے اپنی کتاب "پیامِ گنج شکر" میں (جس کا ذکر آئے گا)، صفحہ نمبر ۶۲ پر، بلبن کی تخت نشینی کی تاریخ اٹھارہ فروری ۱۲۶۶ء لکھی ہے جو گیارہ جمادی الاول ۶۶۴ھ بنتی ہے۔ تین کتابوں کے حوالے نیچے درج ہیں۔

(۱) "تاریخِ فیروز شاہی" مؤلف: ضیاء الدین برنی مترجم: ڈاکٹر سید معین الحق ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز فیروز پور روڈ لاہور سالِ اشاعت: ۱۹۹۱ء صفحہ نمبر: ۱۹۳

"یہ عہد ایسے مشائخ کی موجودگی سے مزین اور مشرف تھا کہ ان جیسی ہستی مدت میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس (بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں، شیخ شیوخ العالم فرید الدین مسعود بہ قیدِ حیات تھے۔ وہ قطبِ عالم اور مدارِ جہاں تھے۔ اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور سائے میں لے لیا تھا......... ان کے قُرب اور برکتِ انفاس کی وجہ سے لوگ دین و دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے (وہ) ان کی اِرادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے۔"

اس کتاب کے فارسی نسخے کے مترجم ڈاکٹر سید معین الحق نے صفحہ نمبر ۱۹۳ کے حاشیے پر، اپنی طرف سے یہ (غلط) وضاحت کی ہے:۔

"شیخ فرید الدین گنج شکر نے ۵ محرم ۶۶۴ھ کو وفات پائی۔ بلبن اسی سال، تین ماہ بعد، یعنی جمادیٰ الاول ۶۶۴ھ میں تخت پر بیٹھا۔"

بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں جو فکری انتشار پیدا ہوتا رہا ہے، مندرجہ بالا (غیر ضروری) وضاحت اُس کی سب سے واضح مثال ہے۔ فاضل مترجم نے یہ وضاحت کرتے وقت یہ بدیہی تضاد بھی مدِ نظر نہ رکھا کہ جمادی الاوّل محرّم کے تین ماہ بعد آتا ہے۔ اگر بلبن جمادی الاول ۶۶۴ھ میں تخت پر بیٹھا (جو وہ اسی سطر میں خود لکھ رہے ہیں) اور اگر اس کے عہد کے ابتدائی دور میں بابا صاحب بہ قیدِ حیات تھے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بابا صاحب بلبن کی تخت نشینی سے تین ماہ پہلے وفات پا چکے ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی، ڈاکٹر معین الحق اور دیگر فاضل مؤرخین مثلاً "تاریخِ فرشتہ" کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ کسی پُر اسرار وجہ سے، ایسی

نظر بندی کا شکار ہوئے ہیں کہ اپنے قلم سے، ایک طرف یہ لکھا کہ بابا صاحب نے (۵ محرم) ۶۶۴ھ میں وفات پائی اور دوسری طرف وہ ماہ وسال لکھے جو (۵ محرم) ۶۶۴ھ کے کہیں بعد آتے ہیں اور لکھا کہ ان مؤخر الذکر دنوں میں بابا صاحب بہ قیدِ حیات تھے۔ ایک دو سے یہ غلطی ہوتی تو قابلِ فہم ہو سکتی تھی لیکن یہاں تو ہر ایک ہی اس نظر بندی کا شکار نظر آتا ہے۔

(۲) ''مرآۃ الاسرار'' مؤلف: شیخ عبدالرحمٰن چشتی (۱۰۰۰ھ تا ۱۰۹۴ھ) مترجم: کپتان واحد بخش سیال
ترجمے کے ناشر: الفیصل اردو بازار لاہور سالِ اشاعت: نہیں دیا صفحہ: ۱۷۷

''آپ (بابا صاحب) کی وفات....... سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔''

(۳) ''پیامِ گنج شکر'' مصنف: ڈاکٹر منظور ممتاز ناشر: نذیر سنز لاہور (۱۹۹۹ء) صفحات نمبر: ۳۰ اور ۶۲

☆ صفحہ نمبر ۳۰: سلطان ناصر الدین محمود دسمبر ۱۲۶۵ء میں بیمار ہوا اور فروری ۱۲۶۶ء میں وفات پائی۔

☆ صفحہ نمبر ۶۲: غیاث الدین بلبن ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو تخت نشین ہوا۔

غیاث الدین بلبن کی ۱۲۶۶ء میں تخت نشینی کی تائید اور تصدیق کے لیے، دو جدید تاریخی کتابوں کے حوالے درج ذیل ہیں:

(A) A New History of India by Stanley Wolpert (Paper back) (3rd edition 1989)
Publisher: Oxford University Press, Karachi - Page 110
"Balban ruled as such until 1266(A.D) when he assumed the title as well as the powers of Sultan."

(B) A History of India(vol-II) by V.D. Mahajan - Page 47 (2nd edition: 1996)
Publisher: S.Chand & Co. Ltd., Ramnagar, New Delhi.
"When Nasiruddin Mahmud died in 1266(A.D), Balban himself became the Sultan"

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بابا صاحب غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی کے سال یعنی ۱۲۶۶ء میں زندہ تھے تو ۱۲۶۵ء ان کا سالِ وفات نہیں ہو سکتا۔ اکتوبر ۱۲۶۵ء میں ہی (پانچ) محرم ۶۶۴ھ آیا، چنانچہ ۶۶۴ھ ان کا سالِ وفات نہیں ہو سکتا۔ یہ ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء کے بابا صاحب کے سالِ وفات نہ ہونے کی ایک ٹھوس خارجی اور تاریخی شہادت ہے۔ مزید ٹھوس اور خارجی شہادت کا استخراج خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات سے کیا گیا ہے، تاہم اس بات کا تعلق چوں کہ بنیادی طور پر اس مضمون کے آغاز میں پوچھے گئے چوتھے، اور آخری، سوال سے ہے، اس لیے اس کا تفصیلی ذکر بھی چوتھے اور آخری حصے میں کیا جائے گا۔

حصۂ سوم | اس حصے میں تیسرے سوال کے متعلق یہ بحث ہوگی کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کے علاوہ، بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں کیا روایتیں ہیں؟ اور وہ کن سے منسوب ہیں؟ ان روایات کی تفصیلات اور راویوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مرأۃ الاسرار: ''آپ (بابا فرید) کی وفات سہ شنبہ (منگل) کے دن پانچویں محرم ۶۶۸ھ، اور دوسری روایت کے مطابق ۶۶۹ھ میں، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔''

(۲) آئینِ اکبری مصنف: ابوالفضل مترجم: محمد فدا علی طالب ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ چوک اردو بازار لاہور سالِ اشاعت: نہیں دیا۔

جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۲۹ پر درج ہے:

''(شیخ فرید گنج شکر) روز شنبہ (ہفتہ) پانچویں محرم ۶۶۸ھ پٹن (پنجاب) میں جو اس وقت اجودھن کے نام سے مشہور تھا، اس دارِ ناپائدار سے رحلت فرمائی۔''

ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ ابوالنصر محمد خالدی کی ''تقویم ہجری و عیسوی'' مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی (۱۹۷۴ء) کے مطابق، پانچ محرم ۶۶۸ھ کو ہفتہ نہیں، بدھ کا دن پڑتا ہے۔

(۳) سوانحِ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ۔ مصنف: وحید احمد مسعود فریدی۔ ناشر: پہلا اڈیشن (۱۹۶۵ء): پاک اکیڈمی، وحید آباد کراچی۔ ناشر: دوسرا اڈیشن (۱۹۹۶ء): ضیاء القرآن پبلی کیشنز، داتا گنج بخش روڈ، لاہور

(i) صفحہ نمبر ۱۸ (دونوں اڈیشنوں میں): ''میں نے حضرت سلطان المشائخ کی تقویت پر سالِ وفات ۶۶۱ھ لکھا ہے۔''

(ii) صفحہ نمبر ۱۸۱ (دونوں اڈیشنوں میں): آخری شب۔ ۵ محرم ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء)

(باقی)

تاریخ اسرائیل کا ایک ورق

مترجمہ ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی صاحب ٭

استاذ احمد محارب ظفیری کا یہ مضمون کویت سے شائع ہونے والے رسالے "الکویت" اکتوبر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر احمد نسیم صاحب نے قارئین معارف کے لئے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، اصل مضمون ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ مترجم مضمون نگار کی مراد پانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، تاہم مضمون معلومات افزا ہونے کے علاوہ اسرائیل کی بد طینتی، خباثت اور قومی خصلت کا آئینہ دار ہے، وہ امریکی سرپرستی میں فلسطینیوں کا قتل عام اور عربوں کے ملکوں پر غاصبانہ قبضہ کرتا چلا جارہا ہے، سلسلۂ ابراہیمی کی اس وراثت پر موجودہ جمہوری دور میں غاصب یہودی مسلط ہوگئے ہیں اور دوسرے سلسلے (اسماعیلی) کی میراث تثلیث کے فرزندوں کے نرغے میں ہوگئی ہے، مسلمان اور ان کی حکومتیں اس کی مزاحمت تو درکنار الٹے یہودی اور مسیحی سازشوں کا ایک ایک کر کے شکار ہوتی جارہی ہیں، امت پر ایسا سخت وقت کم ہی آیا ہوگا۔ مترجم یا خود مضمون نگار نے "حضرت ابراہیم کا سلسلۂ نسب اور ان کا دور" عنوان تجویز کیا تھا جس کو ہم نے تبدیل کردیا، خیال ہے کہ تبدیل شدہ عنوان مناسب ہوگا۔" (ض)

قدیم مورخین احادیث کے رواۃ اور اخباریین اس امر پر متفق ہیں کہ سیدنا ابراہیم

٭ لکچرر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

خلیل اللہ علیہ السلام جنوب عراق میں واقع 'اُور' شہر کے باشندے تھے، جس کے آثار و باقیات کھائیوں، مٹی کے ٹیلوں اور مشہور زقورہ (بلند طبقات کی شکل میں تعمیر مکان) شہر ناصریہ (یہ شہر اپنے بانی ناصر باشا بن راشد السعدون سے منسوب ہے) میں صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ عہد عثمانی میں جب لوگ اس شہر 'اُور' اور اس کے اطراف میں کھدائی کرتے تھے تو انہیں وہاں زمین میں دبی اشیا و سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی مورتیاں نیز مختلف معادن اور مٹی کے برتن دستیاب ہوتے تھے۔ ہمارے خیال میں ابتدائے تاریخ سے ہی اس شہر 'اُور' کا نام عربی الاصل ہے، حور یا حیرہ یا حایر وغیرہ تمام نام بڑی کثرت سے نہ صرف دور جاہلی میں جزیرہ عرب میں مستعمل تھے بلکہ آج بھی ان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'حیرۃ السوبان' 'حایر سبیع' نامی مقامات مملکت سعودیہ میں موجود ہیں۔ فصیح زبان میں 'الحیرۃ' اور 'الحایر' اس مقام کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہوجائے اور وہاں سے باہر نہ نکلے۔ دوسرے مقامات کے بھی اس طرح کے نام بڑی کثرت سے موجود ہیں۔

بعض تاریخی مراجع سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ لفظ 'اُور' قدیم کلدانی زبان کا لفظ ہے جو 'میدان' یا 'شہر' کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔

'ابراہیم' قدیم عربی زبان کا لفظ ہے جو مختلف صورتوں میں لکھا جاتا ہے 'ابراھام'، 'ابرھم' اور 'ابراھم'، برھم الرجل کے معنی ہیں اس نے نظر جمائی۔ اس کی تصغیر 'بریھیم' آتی ہے۔

حضرت ابراہیم کا نسب اور ان کی سرگزشت

قدیم مورخ اور اخباری بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن اُزر یا تارح کا نسبی تعلق ایک بڑی انسانی جماعت (بڑے قبیلہ) سے ہے۔ اس قبیلہ کو کلدیین یا کلدانیین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس کا

واحد کلدی یا کلدانی ہے۔ جب کہ بعض مورخ اور محقق ان کلدانیوں کو آرامیین کا نام دیتے ہیں یا انہیں آرامیین کی ایک شاخ یا آرامیین کو کلدینوں کی ایک شاخ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور یہ کلدانیہ یا کلدینہ انسانی برادری کی ان جماعتوں میں سے ایک جماعت ہے جو خشک سالی اور قحط کے باعث جزیرۂ عرب سے ہجرت کر کے نکلی تھی۔ جزیرۂ عرب میں یہ صورت حال چوتھے پالائی دور کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس دور کو دور فرم (WURM) کے نام سے جانتے ہیں اور یہ ۴۰۰۰۰ ق۔م۔ سے شروع اور ۱۸۰۰۰ ق۔م۔ پر ختم ہوتا ہے لیکن لوگوں کو اس خشک سالی کے اثرات کا احساس خود اپنی برادری اور اپنے مویشیوں پر سال ۱۵۰۰۰ ق۔م۔ سے قبل نہیں ہوا۔ جب خشکی اور گرمی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس کا سبب خشک گرمی کے دور کا جاری رہنا تھا اور ہم اسی دور میں رہ رہے ہیں۔

امام احمدؒ بن حنبل نے اپنی کتاب المسند اور ابو عبداللہ الحاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب المستدرك على الصحيحين میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لاتقوم الساعة حتى تعود ارض العرب مروجاً و انهاراً۔ یعنی قیامت نہیں آئے گی جب تک سرزمین عرب سبزوں، باغوں اور نہروں والی نہ ہو جائے۔

یہ کلدانی قبائل وہی تھے جن سے سیدنا ابراہیم خلیلؑ کا سلسلہ نسب ملتا ہے جو اصلاً بدوی عربی قبائل تھے۔ یہ اپنی ہجرت کے ابتدائی دور میں مغربی زرخیز ہلال کی وادی یعنی (FERTILE CRESCEUNT) کے علاقہ اور جزیرہ عرب کے اطراف میں منتقل ہوئے تھے اور بارانی علاقوں اور گھاس کے میدانوں سے گزر کر اس وادی میں پہنچے تھے۔ تاریخ نگار بتاتے ہیں کہ ان کلدانی قبائل کی بعض شاخوں نے ۱۷۵۰ ق۔م میں خلیج عربی اور جنوب عراق

میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہاں ایک طویل عرصہ گزارنے کے باعث انہوں نے ایک اہم تہذیب کی بنیاد ڈالی جو انسانی تاریخ کی ابتدائی تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے اور اسے مملکت کلدانیہ کی تہذیب یا مملکت بابلیہ ثانیہ سے موسوم کرتے ہیں جس کی حکومت ۶۲۶ ق۔م سے ۵۳۹ ق۔م تک قائم رہی۔ اس تہذیب سے وابستہ حکمرانوں کے نام نیز ان کی تہذیب کے باقیات کا تذکرہ مٹی پر تحریروں میں ملتا ہے۔ ان کی اولین نقل و حرکت اور ان کے قدیم ترین سلسلۂ نسب کا مسئلہ آج بھی تاریخ اور آثار قدیمہ کے ماہرین کے درمیان موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ لہٰذا حتمی طور پر عراق میں کلدانیوں کے داخلہ کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب تک وہ خلیج عرب میں مستقل طور پر آباد نہیں ہوئے اور اس علاقہ کو خلیج کلدی کے نام سے جانا جانے لگا اس سے پہلے کے ان کے حالات مٹی پر کندہ تحریروں میں نہیں ملتے یہ دراصل ان کی شہرت یافتہ مملکت کے قیام کے بعد ہی ہوا۔ اس کا ذکر بڑے عمدہ انداز میں سفر ایوب میں ہے جو عہد قدیم (OLD TESTAMENT) کے اسفار میں سے ایک ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کلدیوں کی اقامت گاہیں سبائیوں کی رہائش گاہوں کے قریب واقع ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خانہ بدوش بدوی قبیلہ کی شکل میں سامنے آنے لگے تھے۔ اور فصحا کی زبان میں سرزمین کارہ کنکریوں سے خالی انتہائی سخت زمین کی وادی ہے۔ مجلہ لغۃ العرب [illegible] کے اوائل میں بغداد سے نکلنے والا مشہور مجلہ ہے صاحب مجلہ علامہ انستاس ماری کی رائے یہ ہے کہ "عراق میں دولت کلدیہ کے بانی شیخ عربی تھے جن کا تعلق عربی قبائل موسوم بکلدہ سے تھا"۔ (دیکھئے مجلہ العرب ۲: ۵۷۸)

دور حاضر میں بھی شمالی عراق میں ایک قوم کے افراد رہتے ہیں جو کلدان کہلاتے اور اپنے کو عربی النسل اور حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے بتاتے ہیں، یہ لوگ مذہباً نصرانی اور عقیدتاً

مشرقی کنیسہ کے پیرو ہیں۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اس کلدیہ قبیلہ کی اولاد ہیں جس کی متعدد شاخیں۔ ان کی پرورش و پرداخت ۱۷۰۰ ق م میں جنوبی عراق کے شہر 'اور' یا جسے 'اور الکلدان' بھی کہتے ہیں میں ہوئی۔ جب ان کی عمر ۴۰ برس ہوئی تو انہوں نے دین حنیف اور اللہ واحد کی عبادت کی دعوت دینا اور شرک، بدعت اور خرافات کی مخالفت کرنا شروع کیا، یہ ماحول جس میں انہوں نے توحید کی صدا بلند کی وہ دیوی، دیوتاؤں، بتوں اور ستاروں کی پرستش کرتا تھا اور کاہنوں، جادوگروں اور السانوں کے بادشاہوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اللہ کے نبی کو آگ میں جلانے کی کوشش کی لیکن اللہ کے حکم سے وہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی دینے والی بن گئی، یہ وہی زمانہ ہے جب عموریہ مملکت یا جسے پہلی بابلیہ مملکت کہتے ہیں، برسر اقتدار تھی، جس نے ۱۸۹۴ ق م سے ۱۵۹۴ ق م تک حکومت کی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ شدراخ، مشاخ اور (عبدنیغو) نے آگ کی سیج تیار کی جس میں اللہ کے نبی ابراہیمؑ کو ڈالا گیا۔

یہ واقعہ شہر کوثی میں پیش آیا جو اصلاً ایک دریا کا نام ہے جس کے کنارے یہ شہر واقع ہے اس لئے اس کا نام بھی کوثی پڑ گیا۔ اس کے باقیات عراق کے شہر یوسفیہ کے قریب ملتے ہیں، ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی (۶۲۶ھ/۱۲۲۸م) کے مطابق فرات سے کوثی نہر نکالنے والے شخص حضرت ابراہیمؑ کی ماں کے دادا تھے جو کوثی کہلاتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ماں کا نام بونا بنت کرنبا بن کوثی تھا۔ اس روایت کی رو سے یہودی کہتے ہیں کہ یہودیوں کے معبود یہودہ (JEHOVO) نے ہی حضرت ابراہیمؑ کو

ہدایت کی تھی کہ وہ عراق میں واقع 'اور الکلدان' کو چھوڑ کر کنعان یعنی فلسطین کے علاقے میں منتقل ہو جائیں جہاں دودھ اور شہد کافی مقدار میں ہوتا ہے اور معبود یہودہ نے ان سے اس کا وعدہ بھی کیا تھا کہ اس سرزمین پر ان کا تصرف اور ملکیت ہو گی، یہ وعدہ الٰہی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر سرزمین عراق سے ارض فلسطین کی جانب ہجرت کی تو آپ کے ہم راہ بعض وہ کلدانی خاندان بھی تھے جو ان کی رسالت پر ایمان لے آئے تھے۔ اسی طرح ان کے دین پر ایمان لانے والے خود ان کے بعض افراد خاندان بھی ساتھ تھے۔

کنعانیوں کی سرزمین فلسطین جاتے ہوئے ان لوگوں کے راستے میں دریائے اردن پڑا جسے عبور کر کے وہ ارض کنعانیین یا ارض فلسطین کے راستے پر جا پہنچے۔ دریائے اردن کو عبور کرنے کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی جماعت کو عبریین یا عبرانیین کا نام دیا گیا جو عربی فعل عبر یعبر سے مشتق ہے۔ یہ لفظ اسی معنی میں عربی اور عبری زبانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم اور جدید مورخوں، اخباریوں خواہ وہ رومن ہوں یا فارسی، مغربی ہوں یا مسلمان یا یہودی ہوں۔ اس قوم کے نام کے بارے میں سب کی رائے یہی ہے لیکن مورخین کی ایک قلیل تعداد کی رائے یہ ہے کہ عابر بن سام بن نوحؑ کی نسبت سے انہیں عبریین یا عبرانیین کا نام دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے فلسطین میں وارد ہونے کے وقت وہاں کے اصل باشندے کنعانی تھے جو جزیرۂ عرب میں بار بار کی خشک سالی سے تنگ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ پہلے یہ لوگ بحرین و خلیج عرب میں آباد ہوئے تھے پھر ۲۵۰۰ ق م کے آس پاس فلسطین آئے

اور اس سرزمین جنوبی سوریہ اور ساحل سوریہ میں پھیل گئے اور جب حضرت ابراہیمؑ اپنے رفقاء کے ساتھ فلسطین (ارض کنعانیین) میں وارد ہوئے تو یہ لوگ شہر 'حبرون' میں آباد ہو گئے جسے بعد ازاں مدینۂ خلیل کہا جانے لگا۔

مگر یہ لوگ لمبے عرصہ تک فلسطین میں قیام پذیر نہیں رہے کیونکہ بارش کی کمی اور خشک سالی کی زیادتی کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رفقاء کے ہمراہ سیناء کے دوسری جانب مصر کا رخ کیا۔ معبود 'سین' کی نسبت سے اس سرزمین کا نام سینا پڑا تھا جس کے معنی 'چاند' ہوتے ہیں۔ اس وقت مصر پر 'ہکسوس' کی حکومت تھی جو قدیم عربی الاصل تھے اور جزیرہ عرب سے ہجرت کر کے جنوبی فلسطین آئے تھے۔ بعد ازاں مصر جا پہنچے اور سال ۱۷۳۰ ق۔م کے قریب وادی نیل میں سکونت اختیار کر لی اور مصر میں اپنی ایک مضبوط مملکت قائم کی جس کے بارے میں تاریخی معلومات بردی (ایک مصری درخت) کی چھال اور مٹی کی سلیٹوں پر درج تحریروں سے ملتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی تھوڑے عرصہ مصر میں قیام کرنے کے بعد پھر فلسطین واپس آگئے۔ حضرت ابراہیمؑ مصر سے اپنی اہلیہ 'ہاجرہ' کو بھی لائے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں خریدا تھا یا ان کو وہ ہدیہ کی گئی تھیں۔ ان کے نکاح میں آنے کے بعد دو بیویاں ہو گئیں۔ ایک ان کی قدیم بیوی سارہ جن کے اولاد نہیں ہوتی تھی اور دوسری یہ نئی مصری بیوی ہاجرہ۔

مصری بیوی ہاجرہ کے بطن سے جب بیٹا پیدا ہوا تو حضرت ابراہیمؑ بہت خوش ہوئے اور اس کا نام اسمٰعیل رکھا۔ اس نام کے دو حصے ہیں اسمع جو سمع سے ہے اور 'ایل' جس کے معنی اللہ کے ہیں۔ لہذا پورے نام کے معنی ہوئے 'سمع اللہ' یا سمیع اللہ۔

ان ہی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء پیدا ہوئے جنہیں تمام بنی نوع انسان کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا اور جن پر آسمانی رسالت کا سلسلہ ختم ہوا۔

اللہ کا حکم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے خاندان کو لے کر بے آب و گیاہ وادی میں سکونت اختیار کریں۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں اللہ کے مقدس گھر کی بنیاد رکھی تاکہ یہ لوگوں کا مرجع و ماویٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے پیرووں کا مرکز و قبلہ بنے۔

حضرت ہاجرہ کے یہاں ولادت کے تین برسوں کے بعد مشیت الٰہی سے نوے برس کی عمر میں حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بانجھ بیوی کو بھی بچے کی بشارت ملی۔ وہ اس پُرمسرت واقعہ پر خوشی سے ہنس پڑیں اور جب ولادت ہوئی تو اپنے بیٹے کا نام اسحٰق رکھا جس کے معنی 'ضحک' ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نبی حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش سال ۱۷۸۰ ق۔م میں ہوئی تھی۔ ان کا مسکن فلسطین میں واقع شہر بئر سبع بنا۔ ان کی رہائش وہاں موجود عبریین کے ساتھ رہی جو اصلاً کلدی یا کلدانی ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔

حضرت اسحاقؑ کے بیٹے عیسو اور یعقوب

بائبل عہد قدیم کے سفر تکوین میں ہے[1]: جب اللہ کے نبی حضرت اسحٰق علیہ السلام ۴۰ برس کی عمر کو پہنچے تو انہوں نے اپنے چچا کی بیٹی رفقہ بن ناحور سے شادی کی۔ ان کی بیوی رفقہ بھی ان کی والدہ سارہ کی طرح بانجھ تھیں۔ حضرت اسحٰقؑ نے اللہ سے دعا کی جو مقبول ہوئی اور ساٹھ برس کی عمر میں ان کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام عیسو اور یعقوب تھے دوسرے

[1] یہ اور آگے کی مزید تفصیل تکوین کے اصحاح ۲۵ و ما بعد میں ملتی ہے مگر ہمارے پیش نظر کتاب مقدس مطبوعہ مدرسہ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء کا جو عربی نسخہ ہے اس میں بعض مباحث کی تفصیل میں قدرے جزئی اختلاف ہے۔ "ض"

بیٹے کا نام یعقوب رکھا گیا کیونکہ ان کی پیدائش اپنے بھائی عیسو کے بعد ہوئی تھی، حضرت یعقوبؑ کو ہی اسرائیل کا نام دیا جاتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ جوان ہوئے تو ان کی ملاقات ایک فرشتہ سے ہوئی جس نے ان سے کہا کہ وہ اپنا نام تبدیل کر کے اسرائیل کرلیں۔ یہ ایک مرکب لفظ ہے جو دو جز اسر یا اسرا یعنی راز یا خالص دوست اور ایل جس کے معنی اللہ یا الہ ہوتا ہے سے مل کر بنا ہے۔ اس طرح ان کے پورے نام کے معنی اللہ کا راز یا خالص دوست ہوئے۔

تورات کے سفر تکوین میں ہے: بیشک رب یہودا نے یہ کہتے ہوئے حضرت اسحٰقؑ کی بیوی رفقہ کو مخاطب کیا: تمہارے بطن میں دو امتیں ہیں۔ تمہارے بطن سے دو جوان نکلیں گے۔ ایک جوان دوسرے سے زیادہ قوی ہوگا اور بڑا جوان چھوٹے جوان کو غلام بنالے گا۔

سفر تکوین میں یہ بھی ہے کہ عیسو کا رنگ سرخ زرد تھا اس کو العیص یا عیصو کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اس کے بال بھی سرخ اور زیادہ تھے جب کہ ان کے بھائی (یعقوب۔اسرائیل) اس کے بالکل برعکس تھے۔ وہ خیموں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اور شکار و سفر کے علاوہ اپنے خاندان اور قوم سے دور ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنے ان صفات کی بنا پر (یعقوب۔اسرائیل) اپنی ماں کے زیادہ قریب اور محبوب تھے آخر عمر میں جب حضرت اسحٰقؑ کی بینائی جاتی رہی تو انہوں نے وفات سے قبل اپنے محبوب شکاری بیٹے عیسو کو بلایا اور اپنے کھانے کے لئے شکار کرنے کو کہا۔ وہ جانتے تھے کہ اب ان کا آخری وقت آگیا ہے لیکن ان کا بیٹا عیسو اپنے والد کی پکار سننے کے لئے وہاں موجود نہیں تھا۔ ان کی بیوی رفقہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے محبوب بیٹے یعقوب

سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھائیں اور جلدی سے خشکی کی طرف جاکر اپنے والد کے لئے شکار کر لائیں اور والد کے مرنے سے قبل ان کی دعاؤں کی برکت حاصل کریں۔ پس حضرت یعقوبؑ بیابان کی جانب گئے اور اپنے والد کے لئے خشکی کا ایک نر بھیڑ شکار کر کے لائے۔ ان کی والدہ خوب بھن کر شوہر کے پاس کھانے کے لئے لائیں جو بستر مرگ پر تھے۔ پھر انہوں نے اپنے ہاتھوں کا گھیرا بنایا اور اپنے بیٹے یعقوب کو بالوں والی بھیڑ کی کھال کے ساتھ گلے لگایا اور انہیں ان کے بھائی عیسو کے کپڑے پہنائے اور کہا کہ اپنے بیمار والد کے پاس جا کر ان کے قریب بیٹھو۔ جب وہ اپنے ہاتھوں سے چھو کر یہ سمجھ لیں گے کہ تم ان کے بیٹے عیسو ہو تو وہ تمہیں اپنی مبارک دعاؤں سے نوازیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کے شوہر حضرت اسحٰقؑ قریب میں آگئے اور انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو عیسو سمجھ لیا۔ اس طرح رفقہ کی سازش کامیاب ہوگئی اور اللہ کے نبی حضرت اسحٰقؑ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے بیٹے یعقوب کو عیسو سمجھ کر ان کے حق میں یہ دعا کی کہ: اے رب اسے آسمان سے خوش حالی اور زمین کی زرخیزی عطا کر اور اپنے بھائی کا سردار بنا جو تیرے لئے اقوام کو عبادت کرنے والا اور قبائل کو سجدہ کرنے والا بنائے۔ تمہاری ماں کے بیٹے سجدہ کریں اور تمہیں لعنت ملامت کرنے والے خود ملعون اور مبارکباد دینے والے خود مبارکباد کے مستحق ہوں۔

اس طرح اللہ کے نبی حضرت اسحٰقؑ کی مبارک دعائیں ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کے حق میں ان کی والدہ کی سازش اور فریب سے پوری ہوئیں کیونکہ وہ اپنی ماں کو زیادہ محبوب اور عزیز تھے اور وہ ان کے مقابلے میں عیسو کو پسند نہیں کرتی تھیں جو اپنے والد حضرت اسحٰقؑ کو محبوب تھے لیکن وہ ان کی دعاؤں اور برکتوں سے محروم رہ گئے اور اس طرح

جیسا کہ یہودیوں کے صحیفہ تورات میں ہے کہ عیسو اور ان کی امت کے لئے ارض موعودہ کا وعدۂ الٰہی پورا نہیں ہوا اور یہ وعدہ ان کے بھائی حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) اور ان کی امت کی قسمت بن گیا۔ اس سازش کا شکار ہونے کے بعد عیسو افسردہ و ملول اپنے چچا حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس چلے گئے اور ان کی بیٹی محلہ سے شادی کر کے چچا ہی کے پاس جزیرۂ عرب میں قیام پذیر ہو گئے اور عرب کے بعض قبائل کے جد ہوئے۔

حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) اپنے عبری خاندان کے ساتھ فلسطین میں مقیم رہ کر وعدۂ الٰہی سے مستفیض ہوتے اور ارض فلسطین پر بئر السبع کے اطراف میں اپنی جماعت کے ساتھ ایک خانہ بدوش بدوی عرب قبیلہ کی طرح زندگی گزارتے رہے۔

حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) نے اپنے ماموں کی دو بیٹیوں (لیئہ یا لیا اور راحیل) سے شادی کی اور ان دونوں سے ان کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے جن سے یہودیوں کے بارہ[12] قبیلے چلے جن کے بارے میں قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے: یٰا اَبَتِ اِنِّی رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَباً وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سَاجِدِیْنَ (یوسف ۱۲: ۶) ان کے بارہ[12] بیٹوں کے نام یہ تھے: روبین[1] یا روبیل، شمعون[2]، ایساقر[3] یا یساکر، لاوی[4]، یہوذا[5]، یوسف[6]، زبولون[7]، بنیامین[8]، نفتالی[9]، دان[10]، جاد[11] اور آشیر[12]۔ ان کا ذکر یہود کے یہاں خاص کر بار بار اور عام تاریخوں میں بھی آتا ہے۔ اسرائیلی عقیدہ کے تحت ان اسباط کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے کو ان ہی کی نسل کا بتاتے ہیں۔ ہمارے دور میں بھی ہر اسرائیلی خود کو اور اپنے خاندان کو کسی ایک سبط ہی کے نام کی نسبت سے متعارف کراتا اور اپنے کو اسی کی نسل کا مانتا ہے۔ ان کے مدارس میں بھی ان کو یہی سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے خون میں کسی ملاوٹ کے قائل نہیں ہیں۔

تاریخ ہمیں حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) اور ان کے قبائل و اولاد کے بارے میں بتاتی ہے کہ جب ان کی اور ان کے ساتھی عبریوں کی تعداد فلسطین (ارض کنعان) میں بہت زیادہ ہو گئی تو ایک سال سخت خشک سالی اور قحط آیا جس کے نتیجہ میں وہ مصر کی جانب ہجرت کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ ان کی یہ ہجرت بدوی جماعتوں کی شکل میں اس طرح ہوئی کہ ان کے ہمراہ ان کے مویشی، گھوڑے، اونٹ اور گدھے نیز بھیڑ بکریاں بھی تھیں۔ انہوں نے بئر السبع کے علاقے سے جنوب فلسطین میں صحرائے نقیب کی جانب سفر کیا۔ پھر صحرائے سینا سے گزر کر مصر پہنچے اور نیل کی مشرقی وادی کے کنارے سکونت اختیار کر کے ایک خانہ بدوش قبیلہ کی شکل میں رہنے لگے۔ انہیں سبزہ زاروں اور گھانس کے میدانوں کی تلاش برابر رہتی تھی تاکہ اپنے مویشیوں کے لئے چارہ مہیا کر سکیں۔ بنو اسرائیل (عبریوں) نے مصر میں ۴۰۰ برسوں تک قیام کیا اور ان کی تعداد سیکڑوں ہزار تک جا پہنچی۔ مصریوں نے اپنی سرزمین میں گھومنے والے ان عبری خاندانوں کو عبیرو یا جبیرو کا نام دیا۔ تورات کے عہد نامۂ قدیم میں یہ عبیرو لفظ عبریین سے آیا تھا اور چونکہ عبریین بدوی خانہ بدوش قبائل تھے لہذا اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ مصریوں کے نزدیک اس کے معنی 'بدور حل' ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ کی بعثت اور ان کے واقعات

سرزمین مصر پر اللہ تعالیٰ نے ان عبریوں (بنو اسرائیل - بنو یعقوب) میں اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا، انہوں نے یہاں کے لوگوں کو اپنے نئے دین کی دعوت دی جو اہل مصر کے مشرکانہ عقائد اور دیوی دیوتاؤں کے تصورات کے خلاف تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی دعوت دین میں زور پیدا ہوا اور اس کی تائید کے لئے معجزات الٰہیہ کا ظہور ہوا لیکن جب مصر کا بادشاہ فرعون حضرت موسیٰؑ کا سخت دشمن ہوا ان کے قتل کا در پے ہوا

تو انہوں نے اور ان کی جماعت عبرانیوں نے ۱۲۰۰ ق م میں مصر سے خروج کا فیصلہ کیا جو بنو اسرائیل کا خروج ثانی تھا۔ یہ لوگ صحرائے سینا رہوتے ہوئے سرزمین فلسطین کی جانب بڑھے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ صحرائے سینا رکا یہ نام سین یعنی چاند کی نسبت سے پڑا تھا۔ اسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہود کی شریعت نازل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یہود صحرائے سینا رمیں قیام پذیر رہے اور اسی دوران شریعت نازل ہوئی۔ جسے بنی اسرائیل کی تاریخ میں (فترۃ التیہ) یعنی دور گمراہی کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی پوری تاریخ تناقضات سے پُر ہے۔ انہوں نے یہود کے عقیدے اور حضرت موسیٰؑ پر صحرائے سینا رمیں نازل ہونے والی شریعت کا ربط و تسلسل دین ابراہیمی سے اس لئے ملا دیا ہے تاکہ وعدۂ الٰہی یعنی ارض موعود میں اپنی سیادت کے حق کو یقینی بنائیں۔ ان کے خیال میں حضرت ابراہیمؑ سے کیا جانے والا وعدہ ربانی یہود کی نسل میں پیدا ہونے والے ایک نبی سے اس کے بعد میں آنے والے نبی کی جانب منتقل ہوتا رہا۔ اس طرح یہ وعدہ آج بھی قائم ہے اور وہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ پس بنو اسرائیل کو ارض موعود پر سیادت و غلبہ کا حق مستمر ہے اور اس وعدہ کو دولت یہود کے اہم رکائز میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل جاننے کے لئے سفر تکوین کے ۱۷ ویں اصحاح کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آئیے دیکھیں کہ اس کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے اور اس نے کس طرح یہود کی تحریف و تبدیل کا پردہ فاش کیا ہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کہتا ہے: مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ یعنی ابراہیمؑ یہودی نصرانی اور مشرک نہیں تھے بلکہ اللہ کے خالص فرمانبردار بندے تھے۔ اور ان کی ذریت کے متعلق فرماتا ہے: اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ

وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۔۔۔۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

(۲) اسرائیلی ریاستیں صحرائے سینا رمیں ۴۰ برس تک بھٹکنے کے بعد اسرائیلیوں (عبریوں) نے ارض موعود کی جانب اپنا سفر شروع کیا اور وہاں رہنے والی عرب اقوام سے جن میں اہم اور بڑی قوم کنعانیوں کی تھی ان کی طویل جنگیں ہوئیں۔ آج یہودیوں کے پاس جو تورات رہ گئی ہے اس کے عہد قدیم کے پانچ اسفار میں ان جنگوں کی تفصیل مذکور ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے شاگرد یوشع بن نون نے کنعانیوں کی کمزوری، تقسیم اور بکھراؤ کے باعث ایک ریاست قائم کی جو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہود جب تک فلسطین میں رہے اس پورے عرصہ میں وہ کوئی حقیقی ریاست قائم نہیں کر سکے سوائے حضرت داؤد علیہ السلام کے دور کے۔ جن کی سیادت میں انہوں نے ۱۰۰۰ سال قبل میلاد القدس پر قبضہ کر کے ایک ریاست قائم کی تھی جس کی فلسطین کے اصلی باشندے کنعانیوں نے زبردست مخالفت کی تھی۔ حضرت داؤدؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ نے بھی ایک سلطنت قائم کی تھی۔ جن کے بارے میں تاریخ کی کتابوں اور قرآن کریم میں معلومات ملتی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے ایک عظیم الشان ہیکل بھی اللہ یہودہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا۔ یہودیوں کے نزدیک اللہ کا یہی نام تھا حضرت سلیمانؑ کی ۹۳۵ ق م میں وفات کے بعد ان کے بیٹے ملک رحعام نے یہودی ریاست (عبرانی مملکت) کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی مگر ان کے دور میں عبرانیوں کی مملکت

باہمی اختلافات کے نتیجے میں دو متحارب مملکتوں میں تقسیم ہوگئی۔

۱۔ ایک مملکت شمال میں تھی جسے مملکت اسرائیل یا دولت اسرائیل کہتے تھے اور بعض لوگ اسے دولت یا مملکت سامرہ کہتے ہیں کیونکہ اس کی راجدھانی شہر سامرہ میں تھی جو آج نابلس کے نام سے ایک شہر ہے۔ شمال کی یہ مملکت دس اسباط کی اولاد سے قائم ہوتی تھی جن کے نام: ذریہ روبین، ذریہ شمعون، ذریہ لاوی، ذریہ ایساقر، ذریہ زبلون، ذریہ یوسف، ذریہ دان، ذریہ نفتالی، ذریہ جاد اور ذریہ اشیر ہیں۔ اس شمالی دولت کا زعیم ملک یربعام تھا۔ اس نے اپنی رعایا پر اورشلیم یا القدس شہر جانے کی پابندی لگادی تھی تاکہ جنوبی مملکت کی رعایا کے ساتھ ان کا باہمی اختلاط نہ ہو۔ اس نے گاؤں بیت ایل میں ایک مذبح قائم کیا تھا جو شہر رام اللہ کے قریب واقع ہے اور اس قربان گاہ پر اس نے سونے کا ایک بچھڑا بنوایا تھا جس کی پرستش کرنے کا حکم اس نے اپنی رعایا کو دیا تھا۔

۲۔ دوسری مملکت جنوب میں تھی جو رجعام کی قیادت میں قائم ہوئی تھی اور جو یہوذا یا یہودا کی نسبت سے مملکت یہوذا یا مملکت یہودا کہلاتی تھی۔ اس کی راجدھانی اورشلیم یا القدس نامی شہر میں تھی۔ اس جنوبی مملکت کے شہریوں میں یہوذا اور بنیامین کی ذریات شامل تھیں۔

یہودی مملکتوں کی بربادی | عراق کے آشوری حکمراں سرجون ثانی کے ہاتھوں ۷۲۲ ق م میں شمالی مملکت یعنی مملکت سامرہ کی بربادی عمل میں آئی۔ اس حکمراں کی حکومت ۷۲۲ ق م سے ۷۰۵ ق م تک جاری رہی۔ اسے آشوری حکومت اور مملکت کو آشوری مملکت کا نام دیا گیا۔ یہ نام ان کے آشور نامی دیوتا کی جانب نسبت کے باعث

دیا گیا جس کی یہ لوگ عبادت کرتے تھے۔ آشوریوں کا قبیلہ ۳۵۰۰ ق م میں جزیرہ عرب سے یہاں اس وقت وارد ہوا تھا جب برفانی اور بارانی دور کے خاتمہ کے بعد حرارت اور خشک سالی کے دور نے جزیرہ عرب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ قبیلہ دو دریاؤں کے درمیان واقع میسوپوٹامیا (MESOPOTAMEA) میں وارد ہوا تھا اور اس نے ایک بڑی آشوری مملکت قائم کی اور خلیج عرب عراق بحر ابیض متوسط کے علاقے اور ملک شام اس کے زیرنگیں رہے، ان کا اقتدار ۱۵۹۵ ق م سے ۶۱۲ ق م تک جاری رہا۔

جنوبی مملکت یعنی مملکت یہوذا کی تباہی ۵۸۶ ق م میں بابلی کلدانی بادشاہ بنوخذ نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ اس بادشاہ کا نام بختنصر بھی تھا۔ اس کی حکومت ۴۳ برس یعنی ۶۰۵ ق م سے ۵۶۲ ق م تک قائم رہی جسے اس کی کلدیوں یا کلدانیوں کی جانب نسبت کے باعث کلدانی یا کلدی کہا جاتا ہے اور جنھوں نے کلدانی بابلی مملکت قائم کی تھی جس کا اقتدار ۶۲۶ ق م سے ۵۳۹ ق م تک رہا۔ اس کی راجدھانی عراق کا شہر بابل تھا۔ جب شاہ بابل کلدانی بنوخذ نصر نے یہوذا کی مملکت کو برباد کیا اور اس کی راجدھانی اورشلیم یا القدس شہر کو آگ لگائی تو اس نے بڑی تعداد میں اسرائیلیوں (یہود) کو قیدی بھی بنایا جنھیں وہ اپنے ساتھ عراق لایا اور وہیں آباد کیا۔ بابل لے جائے جانے والے یہود (عبرانیوں) قیدیوں کی تعداد ۷۰۰۰ تھی، اس قید کو تاریخ میں قید بابلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بابلی حکومت نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور انہیں ان کے مخصوص طریقے کے مطابق عبادت کرنے اور اپنی مرضی سے اپنے کام کرنے کی آزادی دی تھی۔ شاہ فارس کورش نے ۵۳۹ ق م میں عراق پر حملہ کیا اور شہر بابل پر قبضہ کرلیا اور یہود کو آزاد کرکے انہیں فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔

اسرائیل کی دربدری | تاریخ کے قدیم دور میں اور موجودہ دور میں بھی عربی یا اسرائیلی قوم ایک خانہ بدوش اور عبوری طور پر رہنے والی واحد قوم رہی ہے۔ دو مقدس اور کریم بادشاہوں داؤد اور سلیمان کے دور کو چھوڑ کر کبھی بھی ان کی حکومت و مملکت نہیں رہی، ان دونوں بادشاہوں کا دور صرف ۷۰ برس رہا اور ان کے زیر اقتدار بھی ارض فلسطین کا پورا علاقہ نہیں تھا۔ ان دونوں بادشاہوں کی مملکتوں کی راجدھانی شہر اورشلیم تھا جس پر شاہ داؤد نے کنعانیوں کی مخالفت کے باوجود قبضہ کر لیا تھا۔ کنعانی اصلاً قدیم عرب تھے اور فلسطین کی آبادی میں ان کی اکثریت تھی۔

ماضی اور حال میں نشر و اشاعت کے ذرائع، اسرائیلیوں کے زبردست پروپگنڈے اور شور و شغب کے باوجود تاریخ اور آثار قدیمہ کے ماہرین کی نظروں کے سامنے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت داؤد اور ان کے بیٹے کی حکومت کے تاریخی ثبوت کے طور پر کوئی منقوش پتھر یا کتبہ وغیرہ نہیں پایا جاتا، تاریخی کتب اور دینی مراجع میں ان کی مملکت کے بارے میں جو کچھ موجود ہے زمین پر یا زیر زمین اس کا کوئی ثبوت کبھی بھی نہیں رہا۔

اس طرح شہر القدس ایک قدیم عربی نام ہے جیسا کہ یونانی اور عربی مصادر و مراجع میں اور قدیم مٹی کی تحریروں پر رقم ہے۔ اسے اورسلیم، یا اورسلام، یا اورسالم کہا جاتا ہے اور لفظ اور کے معنی علاقہ یا شہر ہے۔ اس طرح اس نام کے معنی امن و سلامتی کا علاقہ یا شہر ہے۔ بعض مراجع کہتے ہیں کہ اس شہر کا بانی جزیرہ عرب سے یہاں ہجرت کر کے آنے والے قدیم عربی قبائل کا ایک شخص تھا جس کا نام سلیم یا شلیم یا سالم یا شالم تھا لہذا اس شہر کا نام اس شخص کے نام پر سلیم شہر یا شلیم شہر یا سالم شہر یا شالم شہر رکھا گیا، یہ اور

اس طرح کے دوسرے سب نام عربی ہیں جو عرب قبائل میں مستعمل اور متداول ہیں۔ عربی اور عبری دونوں خصوصاً قدیم عبری زبان میں ایسے ناموں اور لفظوں کی کثرت ہے جن کے معنی اور نطق و دلالت میں شباہت ملتی ہے۔

موجودہ تورات کی نوعیت | دور حاضر میں اسرائیلیوں کی مقدس مذہبی کتاب تورات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

اول: عہد قدیم جو یہودی شریعت کا اولین مصدر ہے۔ اسرائیلی عقیدے کے مطابق یہی کتاب صحرائے سینا میں ان کے دور ضلالت میں حضرت موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ یہ کتاب عہد قدیم پانچ اسفار پر مشتمل ہے۔ ان میں ہر سفر کی تکوین چند اصحاح سے ہوئی ہے۔ ان میں تاریخی اور افسانوی قصے اور روایات کا ذکر سرسری طور پر ملتا ہے جن میں متضاد و مخالف باتیں بھی ہیں۔

دوم: کتاب تلمود جس کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمینی کتاب ہے جس کی ترتیب آسمانی وحی کے ذریعہ نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ تلمود کے معنی تعلیم ہیں۔ مذہب یہود میں اس کتاب تلمود کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسے احبار یہود نے دونوں مملکتوں کی تباہی کے بعد ترتیب دیا تھا اور انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ اس میں اپنے مذہب کے لئے ہر ضروری قاعدہ، حکم، وصیت، شرح اور تعلیم شامل کر کے اسے عہد قدیم کے لئے ایک آئینہ بنا دیں۔ لہذا کتاب تلمود ایک مجموعہ سنت ہے جس سے یہود باہمی اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں ہدایت حاصل کرتے ہیں اور اسی کے احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ تلمود دو کتابوں میں تقسیم ہے:

۱۔ تلمود بابلی: اس کتاب کو احبار یہود نے ما قبل مسیح پانچویں صدی کے آخری دور میں

زمانہ صحرانوردی کے دوران بابل شہر کے قریب لکھا تھا۔ اس میں ۳۶ مقالے شامل ہیں۔ یہی تلمود بابلی آج قوم یہود کے درمیان سب سے زیادہ رائج ہے۔

۲۔ تلمود اوروشلیمی: اس تلمود کو شہر القدس کے احبار نے دوسری عیسوی صدی کے ابتدائی دور میں لکھا تھا۔ اس کی تکمیل چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی اور اس میں ۳۹ مقالات ہیں۔

جو شخص بھی تورات خواہ وہ عہد قدیم ہو یا کتاب تلمود کو پڑھے گا وہ اس نتیجے تک ضرور پہنچ جائے گا کہ ان دونوں کتابوں میں جو اخبار، دینی عقائد و معلومات یا افسانوی قصے اور حکایات درج ہیں وہ سومری، اکادیہ، آشوریہ اور بابلیہ تہذیبوں سے مکمل طور پر یا ان کا بڑا حصہ ان سے اخذ کردہ ہے۔ یہود کے علماء و احبار اپنی عبرانی قوم کے ساتھ بالعموم آشوری بابلی دور میں عراق آئے اور ایک طویل زمانہ تک بابل میں اور دو دریاؤں کے درمیان پڑنے والے دیگر شہروں میں قیام پذیر رہے اور یہیں انہوں نے اپنی مذہبی کتاب تورات لکھا اور اس کی تدوین کی۔ اس دوران وہ دو دریاؤں کے مابین ملکوں بالخصوص وادی نیل کے ملک میں تاریخ کے ابتدائی دور میں اپنے اطراف میں نشوونما پانے والی تہذیبوں سے متاثر ہوئے۔

تاریخ دانوں کے سرخیل ڈاکٹر جواد علی نے سعودی میگزین الفیصل کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں ستمبر ۱۹۸۹ء کے شمارہ نمبر ۱۵۲ کے صفحہ ۳۰ پر کہا ہے کہ: "بلاشبہ تورات تاریخ کی ایک کتاب ہے جو آسمان سے نازل نہیں ہوئی۔ یہ ہمارا نقطۂ نگاہ ہے جس کے لئے مورخوں کی سند و ثبوت غیر ضروری ہے۔ کوئی بھی معقول شخص جو منطقی اور تنقیدی نظر رکھتا ہو وہ ان مسائل کو قطعی نظر انداز نہیں کرے گا۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ روایات کی تدقیق اور ان کی

صحت پر زور دیں"۔

فلسطین کے باشندوں کے بارے میں ڈاکٹر جواد علی فرماتے ہیں: "بلاشبہ تمام آثار قدیمہ اور کتابی مصادر اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ عبرانیوں کے زمانہ میں جو فلسطین کے اصل باشندے تھے وہ اصلاً عرب تھے۔ ان میں اہل مدین بھی تھے جن میں حضرت موسیٰؑ نے شادی کی تھی۔ اس معاملے میں مشکل یہ ہے کہ کلمۂ عرب، عبرانیوں اور دیگر اقوام میں اعراب، یعنی 'بدو' کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ لہذا انہوں نے فلسطین کے باشندوں کا ذکر صرف ان کے قبیلے کے ناموں سے ہی کیا ہے۔ پس انہوں نے باشندگان فلسطین کو عرب نہیں سمجھا۔ کیونکہ وہ اعراب نہیں تھے۔ یہاں اس غلطی کی اصلاح ضروری ہے۔

دو غلطیوں کی تصحیح

۱۔ نومبر ۲۰۰۱ء کے مضمون "حضرت عبداللہ بن زبیر کا قتل" صفحہ ۳۴۶ کی آخری سطر میں "خلفائے" کے بعد حق کا لفظ چھپنے سے رہ گیا۔

۲۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں "یک دونا قبول" کی ساتویں سطر میں "نہیں" کے بجائے "ہیں" ہے۔

تاریخ کشمیر کا ایک خونچکاں واقعہ

از پروفیسر عبدالاحد رفیق صاحب ٭

تیرھویں صدی عیسوی میں دفعتاً تاتار کی جانب سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا۔ ۶۱۷ ہجری میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا۔ کم و بیش ۴۰ لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا۔ سینکڑوں ہزاروں شہر خاک کے برابر ہو گئے۔ مدارس و خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اڑ گیا۔ چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا اور اپنی فوری اور سرسری انتظامات کے لئے اس نے کچھ قاعدے بھی بنائے تھے جو تورۂ چنگیز خان کے نام سے مشہور ہیں۔ تاتاری لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔

تاتار اور منگولوں نے اپنے میدانوں سے نکل کر ایشیا اور یورپ کے کافی حصے کو پامال کر دیا تھا۔ کشمیر پر بھی انہوں نے متواتر حملے کئے۔ چنگیز خاں کے بیٹے دوغتائی خاں نے اپنے سپہ سالار گاتو کو ہندوستان اور کشمیر کی طرف روانہ کیا اور وہ ان دونوں ملکوں کے مختلف اطراف و جوانب کو لوٹ مار کر واپس ہوا اور پھر سنہ ۱۲۵۳ء میں طیر کو ہندوستان اور کشمیر پر فوج کشی کے لئے بھیجا، طیر کی وفات کے بعد فوج کی کمان تسلی نے سنبھالی۔ اس کے بارے میں

٭ نزد سٹیل فیکٹری، اپر صورہ، سری نگر۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کشمیر کو فتح کیا اور کئی ہزار قیدی ہلاکو خاں کے پاس بھیج دئے مگر منگول اور تاتاروں کے حملوں کی تفصیلات کا سراغ نہیں ملتا اور ان حملوں کی نوعیت چھاپہ مارنے کی سی ہے جو کشمیر کے سرحدی پہاڑوں تک محدود رہے۔ سنہ ۱۳۲۰ء کے موسم بہار میں ذولچو کا حملہ بھی وادی کشمیر کو فتح کرنے کی کوشش کے سلسلے میں ہوا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذولچو کون تھا؟ جس نے وادی کشمیر اور خاص کر سرینگر کو تباہ و برباد کر ڈالا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا اور جس نے کشمیر کو دیکھتے دیکھتے تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ جون راج مشہور مورخ اس کو راجہ کرم سین کا ایک فوجی سردار بتاتا ہے۔ لیکن خود کرم سین کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔ ابوالفضل جس کی اس عہد کے کشمیر کی تاریخ کی تمام معلومات سنسکرت تاریخوں سے ماخوذ ہیں۔ ذولچو کو قندہار کے حکمران کا سپہ سالار بتاتا ہے۔ نظام الدین اور مورخ فرشتہ اس کو قندہار کے حکمران کا میر بخشی بتاتے ہیں۔ لیکن یہ سب بیانات تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ قندہار اس زمانے میں کسی تاتار کے ماتحت نہ تھا۔ بلکہ ہرات کے کرت حکمران غیاث الدین کی ملکیت میں تھا۔ جو فارس کے ایلخانی خاندان کا باج گذار تھا۔ غیاث الدین بذات خود اتنا قوی حکمران نہ تھا جو کشمیر کی تسخیر کے لئے اپنی فوج بھیج سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ملک کی اندرونی بغاوتوں اور سازشوں کو دبانے میں وہ پریشان تھا۔ لہذا یہ کہنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ ذولچو قندہار سے آیا تھا۔ ذولچو اصل میں منگول تھا اور وہ ترکستان سے آیا تھا۔ جو اس زمانے میں چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خاں کی نسل کے حکمراں کے ماتحت تھا۔ جس کے لشکر میں ترک اور منگول نسل کے لوگ شامل تھے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ذولچو مسلمان نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں چند چغتائی سردار مسلمان ہو چلے تھے ذولچو اور اس کے مشیر مشرکانہ اعتقاد کے پیرو تھے۔

محب الحسن کا بیان ہے کہ ذولچو نے ۱۳۲۰ء کے موسم بہار میں وادی کشمیر پر حملہ کیا۔ جبکہ محمد الدین فوق نے حملے کی تاریخ ۱۳۲۳ء بیان کی ہے۔ صاحبزادہ پروفیسر حسن شاہ نے ۱۳۳۱ء لکھی ہے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت راجہ سہ دیو کی حکومت تھی۔ بہرحال ذولچو تاتاری اور منگول ستر ہزار سوار ہمراہ لے کر کابل اور پنجاب کے راستے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا اور چونکہ کشمیر میں اس وقت دفاع کا کوئی معقول انتظام تھا۔ اس لئے اس کو کسی مضبوط اور قوی مزاحمت کا مقابلہ نہ کرنا پڑا۔ سہ دیو حملے کی تاب نہ لاسکا اور اس کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کا دل دہل گیا۔ کیونکہ اس نے پنجاب اور کابل میں اس کے ظلم وستم اور جور وجفا کی داستانیں سنی تھیں۔ وادی کشمیر میں وحشت کا دور دورہ ہوا امیر اور وزیر حواس باختہ ہوگئے۔ تدبیریں سوچنے لگے۔ سہ دیو نے ذولچو کو کافی مال و دولت دے کر لوٹا دینا چاہا۔ یہ دولت اور مال اس نے عوام کے ہر طبقہ سے جن میں برہمن بھی شامل تھے ٹیکس لگا کر جمع کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف وہ اپنی عزت کھو گیا اور دوسری طرف اس کی حرکت نے ذولچو کے حوصلے بلند کئے اور اس کی لالچ اور حرص وطمع میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ بعد میں سہ دیو نے دفاع کرنے کی کوشش کی مگر بے سود، سہ دیو نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس کی مدد کریں مگر عوام نے اس کی اپیل کا بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ عوام کو چھوڑ کر خود کشتواڑ میں پناہ گزیں ہوا۔ حملہ آوروں نے عوام پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے انہوں نے مکانات میں آگ لگادی۔ مردوں کا قتل عام کیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا۔ یہ ظلم اتنا شدید تھا کہ سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جلے ہوئے مکانات لو[illegible] کو حملہ آوروں کی سفاکیوں کی المناک داستان یاد دلاتے رہے۔ ان حملوں سے ضلع لار محفوظ تھا۔ سہ دیو کے سپہ سالار رام چندر نے اپنے آپ کو اس قلعہ میں بند رکھا تھا۔ اس طرح

اس نے اپنے خاندان، اپنے ساتھیوں اور قصبہ کے آس پاس کے لوگوں کو امن وامان میں رکھا۔ اب کشمیر میں رام چندر ہی کی ذات تھی جس کا اثر ورسوخ موجود تھا۔ ذولچو کی روانگی کے بعد وہ اندلوٹ گیا اور وہاں سرکشوں کی بغاوت دبائی۔ تاتاریوں اور منگولوں کا سلسلۂ لوٹ مار کشمیر میں آٹھ مہینے سردی کے آغاز تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں کھیت جوتے ہوئے نہیں گئے کیونکہ وادی کے باشندے یا تو قتل کردئے گئے تھے یا بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ جو کچھ اناج کا ذخیرہ ملک میں تھا اس کو یا تو منگولوں نے جلا دیا تھا یا کھا گئے تھے اور ان کو اناج کی سخت کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لئے ذولچو نے کشمیر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا سبب سردی کا موسم نہیں تھا۔ اس کے افسروں نے اس کو بارہ مولا اور پکھلی ہی کے راستے سے واپس جانے کا مشورہ دیا تھا جس سے وہ کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ کیونکہ یہ راستہ مختصر تھا۔ اور سردیوں میں دشوار گذار نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور قیدیوں سے ہندوستان کا راستہ پوچھ کر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں اس کو اپنی فوج کے لئے رسد ملنے کی امید تھی قیدیوں نے منگولوں سے انتقام لینے کے لئے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا۔ جو برفیل سے گزرتا تھا۔ جب منگولوں کی فوج دیوسر پرگنہ میں پہاڑ کی بلندی پر پہنچی تو اس وقت بہت سخت برفباری شروع ہوئی۔ جس نے ذولچو کی ساری آبادی کو جس میں قیدی بھی شامل تھے ہلاک کردیا۔

منگولوں اور تاتاریوں کی واپسی کے بعد کشمیر کے لوگ جو حملے کے دوران میں غاروں اور بعض دیگر مقامات پر جاکر روپوش ہوگئے تھے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تو دیکھا کہ گھر اجاڑ دئے گئے ہیں۔ مکان جلائے گئے ہیں۔ غربت، افلاس اور مفلسی کا سامنا ہے اور اپنی آنکھوں سے حملہ آوروں کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کو دیکھا۔ ان میں سے کتنے لوگ بے گھر اور بے یار ومددگار ہوگئے تھے۔ ان پریشانیوں کے علاوہ قریب کے پہاڑی قبیلوں نے کشمیر کی

وادی پر حملہ کرکے ان کو پھر سے ستانا شروع کر دیا اور بچے کھچے مال کو لوٹنا شروع کر دیا اور ان کو غلام بنا کر ساتھ لے گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ قحط سالی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اب چونکہ ملک میں کوئی باضابطہ حکومت نہیں رہ گئی تھی۔ اس لئے مقامی سرداروں نے اپنی اپنی خود مختاری کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا۔ بعض حالات میں لوگوں نے خود ہی ڈاکوؤں اور پہاڑی قبیلوں کے حملوں کے خلاف دفاعی انتظام کیا اور حملہ آوروں کو بھگا دیا اور قلعے پر تسلط جما کر ایک بااثر شخص کو اپنا سربراہ بنالیا۔ جن لوگوں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا ان میں سب سے نمایاں رینچن کا نام ہے، رینچن؛ جس کا پورا نام چن گیا لبسور نیچن تھا ایک لداخی سردار کا بیٹا تھا۔ ذولچو کے حملے کے دوران ضلع لار میں موجود تھا اور رام چندر جی نے اس کو امن وامان قائم کرنے اور لوگوں کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنے کے لئے ملازم رکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے فرائض بڑی تندہی اور لیاقت سے انجام دئے۔ جس کی وجہ سے اس کا حلقہ اثر بڑھتا گیا اور عوام کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ ذولچو کی واپسی کے بعد کشمیر میں بہت سے دوسرے اشخاص نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا مگر رینچن نے ایک چال چلائی کہ اپنے لداخی ساتھیوں کو اونی کپڑوں کے تاجروں کے بھیس میں لار بھیجا۔ جو کچھ دن کاروبار میں مشغول رہے اور ایک دن رام چندر کے قلعے میں داخل ہو کر رام چندر کے ساتھیوں پر اچانک حملہ بول دیا۔ رام چندر کی فوجیں ہار گئیں رام چندر خود بھی مارا گیا۔ ان کا بیٹا گرفتار ہوا۔ اب کسی کو رینچن سے کھل کر مخالفت کرنے کی تاب نہ تھی اس لئے وہ ۱۳۲۰ء کے آخر میں کشمیر کا بادشاہ بنا اور بلبل شاہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اسلامی نام صدرالدین رکھا صدرالدین بلبل منکر میں خانقاہ بلبل شاہ کے ساتھ ہی دفن ہے اور ان کا مقبرہ کسمپرسی کا شکار ہو گیا ہے۔

ماخذ

۱؎ واقعات کشمیر محمد اعظم دیدہ مری ۲؎ تاریخ حسن جلد دوم ۳؎ شعر العجم از علامہ شبلی جلد دوم ۴؎ کشمیر انڈر سلطانز از پروفیسر محب الحسن ۵؎ تاریخ کشمیر از فوق ۶؎ طبقات اکبری ۷؎ حبیب السیر از اخوند میر ۸؎ کشمیر از صوفی ۹؎ تاریخ کشمیر از حیدر ملک محفوظہ کشمیر یونیورسٹی ۱۰؎ مسلم رول ان کشمیر ۱۱؎ ویلی از لارنس ۱۲؎ بہارستان شاہی ۱۳؎ آئین اکبری۔ جون راج۔

وفیات

مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری

علمی حلقوں میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۱۸؍نومبر ۲۰۰۱ء کو مولانا عبدالرحیم لاجپوری رحلت فرما گئے، وہ گجرات ہی نہیں اس برصغیر کے ممتاز اور جید عالم دین تھے، فقہ و فتاویٰ پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی، علم راسخ اور فقہ و افتا میں کامل الفن ہونے کے ساتھ ورع و تقویٰ اور سیرت و اخلاق کی پاکیزگی میں بھی سلف صالحین کا نمونہ تھے۔

مفتی صاحب ایک سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کا سلسلۂ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جاملتا ہے، ان کا آبائی وطن گجرات میں لاجپور تھا لیکن ان کی پیدائش ضلع گجرات کے مشہور شہر بلسار کے قصبہ نوساری میں دسمبر ۱۹۰۳ء/شوال ۱۳۲۱ھ میں ہوئی، اپنے دادا مولانا سید ابراہیم صاحب سے تعلیم شروع کی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد والد مولانا سید عبدالکریم صاحب اور چچا حافظ سید حسام الدین صاحب سے حفظ قرآن کی تکمیل کی، قرأت و تجوید میں بڑا کمال حاصل کیا، قرآن مجید بہت اچھا پڑھتے تھے، آواز میں بڑی تاثیر اور لہجہ نہایت دلکش تھا، اس لئے طالب علمی ہی کے زمانے میں نوساری کی جامع مسجد کے امام ہو گئے لیکن جلد ہی قدردانوں نے راندیر بلالیا اور وہاں کی جامع مسجد کا امام مقرر کر دیا۔

مدرسہ محمدیہ عربیہ جامعہ حسینیہ راندیر میں درسیات کی تکمیل کی اور یہیں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، طالب علمی میں فقہ و افتا سے خاص شغف ہو گیا تھا اور اسی زمانے سے اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں فتاویٰ لکھنا شروع کر دیا تھا جس کا سلسلہ مدۃ العمر جاری رہا۔ اس کی وجہ سے ملک میں معتبر فقیہ و مفتی کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور کئی جلدوں میں ان کے فتووں کے مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

ان کے فتوے پہلے گجراتی کے ایک ماہنامہ ''پیغام'' میں بارہ سال تک چھپے اور ان کے

مجموعے پہلے گجراتی میں پھر اردو میں فتاوی رحیمیہ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوئے اور ان کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، جو مفتیوں کے لئے مرجع اور حوالہ کا کام دیتے ہیں۔ ''فتاوی رحیمیہ'' مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے جو فقہ و افتا کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ ہے، عام فتووں کی طرح اس کی زبان خشک، بے کیف اور فنی اصطلاحات سے بوجھل نہیں ہے۔ ان کے مطالعہ سے مفتی صاحب کی فقہی بصیرت، حکمتِ دین سے واقفیت، علمی پختگی اور طبیعت کے اعتدال کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر مدلل، محققانہ اور تشفی بخش جواب دیا ہے، جواب میں اتنی تفصیل و تنقیح کی ہے کہ مسئلہ کے تمام متعلقات اور سارے گوشے سامنے آگئے ہیں۔ کتابوں کے حوالے کے ساتھ اصل عبارتیں بھی نقل کی ہیں اور فقہی کتابوں کے علاوہ قرآن و سنت اور صحابہ کا تعامل بیان کیا ہے اور اس کے نظائر پیش کئے ہیں۔

مفتی صاحب علمی بلند پائیگی کے باوجود نہایت خاکسار و متواضع تھے، شہرت و نام و نمود سے نفرت تھی، روایتی جلسے جلوس سے دور رہتے، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق تھا اس کے نظام امارت شرعیہ گجرات کے امیر رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

مولانا سید احمد ہاشمی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے ممتاز عالم دین اور سرکردہ ملی و قومی رہنما مولانا سید احمد ہاشمی سابق ممبر پارلیمنٹ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ عرصے سے موذی امراض میں مبتلا تھے۔ ۴/ نومبر ۲۰۰۱ء کو ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور اسپتال جاتے ہوئے مالک حقیقی سے جاملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا غازی پور کے ایک شریف خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد حافظ محمد شفیع صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں اس زمانے میں تعلیم پائی تھی جب وہاں مولانا سید سلیمان ندوی بھی زیر تعلیم تھے اس لئے دونوں کے اچھے روابط تھے، مولانا ہاشمی بچپن ہی میں والدین کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی حافظ سید محمد ہاشمی نے کی، ناناہال در بھنگہ

سے غازی پور لاکر یہاں کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ دینیہ میں ان کا داخلہ کرایا، عربی کی پانچویں جماعت تک تعلیم دلانے کے بعد انہیں کلکتہ لے گئے اور مدرسۂ عالیہ میں داخلہ کرایا جہاں سے ''ممتاز المحدثین'' کی ڈگری لی پھر دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید حسین احمد مدنی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد چندے دہلی میں رہے اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات دئے، اسی زمانے میں مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی ناظم جمعیۃ علمائے ہند کی صحبت اور قربت نصیب ہوئی۔

دہلی میں مختصر قیام کے بعد وہ کلکتہ واپس آگئے، ان کے بڑے بھائی چاہتے تھے کہ اب وہ کوئی کاروبار کریں لیکن اس وقت تو وہ بورڈ کے مدرسہ ''ندائے اسلام'' میں مدرس مقرر ہوئے مگر شروع سے دین وملت اور قوم و وطن کی خدمت کی جانب ان کی طبیعت کا رجحان تھا اس لئے اسی مشغلے میں ان کی زندگی گزری۔

کچھ عرصہ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے اور اپنا ایک ہفتہ وار اخبار ''ارمغان'' کے نام سے نکالا جو چل نہ سکا، دوسرے اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ ایک دفعہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑے گو مولانا کا حلقۂ اثر وسیع تھا اور وہ بڑے مقبول بھی تھے مگر سیاست کی پرخار وادی میں بھی انہوں نے درویشی اور عالمانہ وقار کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس لئے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، ایک بار وہ غازی پور سے لوک سبھا کی سیٹ کے لئے کانگریس کے امیدوار ہوئے اور بہت کم ووٹوں سے ہارے مگر اس سے ان کا حوصلہ کم نہ ہوا اور بہ دستور ملی سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

مولانا شروع سے جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم سے وابستہ تھے اپنے اساتذہ اور مدرسہ دینیہ کے بانیوں مولانا عمر فاروق اور مولانا ابوالمحسن صدیقی کی طرح تحریک آزادی اور جمعیۃ علما کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے وہ مغربی بنگال کی جمعیۃ کی شاخ کے جنرل سکریٹری ہوئے۔ مولانا میں بڑی تنظیمی صلاحیت تھی جس کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی تھا، انہوں نے جمعیۃ کے سکریٹری اور راجیہ سبھا کے ممبر ہونے کی حیثیت سے بڑی جرأت، ہوش مندی اور تدبر سے مسلمانوں کی قیادت کی اور فسادات اور مسلم مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا، مولانا ملی اور اجتماعی مفاد کے سامنے اپنے ذاتی اور گروہی مفاد کی بالکل پروا نہ کرتے، ان میں بڑی دور اندیشی اور اچھی سوجھ بوجھ تھی، ان کی رائے معقول اور نپی تلی

ہوتی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں بڑا ہولناک فرقہ وارانہ فساد ہوا، اس میں ریاستی جمعیۃ کے تحت ریلیف اور بچاؤ کا کام نہایت خوبی اور بڑی مستعدی سے انجام دیا جس کے نتیجے میں انہیں مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی طلب پر دہلی جانا پڑا اور جلد ہی آل انڈیا جمعیۃ کے جنرل سکریٹری بنا دئے گئے، ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ملی جمعیۃ علما قائم کی جس کے وہی جنرل سکریٹری ہوئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے اساسی رکن تھے، مسلم مجلس مشاورت اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا، ہر ایک کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ دہلی وقف بورڈ کے ممبر اور چیرمین بھی ہوئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۶ء تک دوبار راجیہ سبھا کے ممبر بنے اور متعدد پارلیمانی وفود کے ساتھ غیر ملکی دورے کئے جن میں روس، چیکوسلوا کیہ، یوگوسلاویہ، سعودی عرب، کویت وغیرہ شامل ہیں۔

دہلی جانے کے بعد بھی کلکتہ سے ان کا تعلق منقطع نہیں ہوا، یہاں برابر تشریف لاتے اور اپنے ایک ایک شناسا سے ملتے، یہاں کے متعدد تعلیمی اداروں اور انجمنوں سے بھی ان کا تعلق آخر تک رہا، وہ بڑے اچھے مقرر تھے، انتخابی جلسوں میں ان کا یہ جوہر خوب کھلتا، وہ انتخابی مہم میں زور وشور سے حصہ لیتے تھے۔

الکشن کے زمانے میں اکثر اعظم گڈھ بھی تشریف لاتے، یہاں کے پارلیمنٹ کے مشہور ممبر چندر جیت یادو سے سیاسی ہم آہنگی کی وجہ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ان کی انتخابی مہم میں حصہ لینا ان کا معمول ہو گیا تھا، کانگریس سے علحدہ ہونے کے بعد دونوں نے اپنی ایک الگ نئی پارٹی بنائی تھی۔ رمضان المبارک میں چندر جیت جی کے گھر پر اکثر افطار پارٹی ہوتی تھی اس میں کبھی کبھی مولانا ہاشمی بھی آجاتے تھے وہ ہوتے تو ہم لوگ ان ہی کی اقتدا میں مغرب کی نماز ادا کرتے۔ اس طرح راقم سے بھی ان کے اچھے تعلقات ہو گئے تھے لیکن اس میں اضافہ اور زیادہ بے تکلفی اس وقت ہوئی جب میں دسمبر ۸۷ء میں دہلی گیا اور حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم نے اپنے لال کنواں کے مکان پر کھانے کے لئے بلایا تو وہاں اور حضرات کے ساتھ مولانا بھی اپنے ایک صاحب زادے کے ساتھ تشریف لائے تھے جن سے ملاتے ہوئے فرمایا کہ تم دہلی آکر چلے جاتے ہو اور کبھی ملاقات نہیں ہوتی، عرض کیا میں بہت کم آتا ہوں پھر میرے جیسے راستہ بھولنے والے شخص کے لئے تنہا دہلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈ لینا بہت مشکل ہے، انھوں نے فرمایا کہ اپنی قیام گاہ کا پتا بتا دو تو میں خود آکر مل لوں گا، میں شرم سے پانی پانی ہو گیا،

چنانچہ اسی سفر میں یا اس کے بعد اپنے ایک عزیز کو لے کر ان سے ملنے گلی قاسم جان میں ان کے گھر پہنچا تو بہت مسرور ہوئے لیکن کہنے لگے کہ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہوگی میں نے عرض کیا آپ سے مل کر جو خوشی ہو رہی ہے اس کے سامنے وہ زحمت ہیچ تھی۔ میں انشاء اللہ اب جب دہلی آؤں گا تو آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ ایک حد تک میں نے اس وعدہ کو نباہا بھی۔ اس سال ۱۱ر نومبر کو مولانا آزاد ڈے میں شرکت کے لئے دہلی جانے کا پروگرام بہت پہلے سے بن گیا تھا اور خیال تھا کہ ۱۲ر نومبر کو رک کر مولانا اور اپنے بعض دوسرے کرم فرماؤں سے ملاقات کروں گا مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سابق ریلوے وزیر الحاج سی۔ کے۔ جعفر شریف صاحب سے مولانا کے بڑے خوش گوار اور مخلصانہ روابط تھے، وہ جب ریلوے کے وزیر ہوئے تو مولانا کو مسافروں کی سہولتوں سے متعلق کمیٹی (PAC) کا ممبر اور پھر چیرمین بنایا، اتفاق سے انہی زمانے میں میرا دہلی جانا ہوا تو مولوی مسعود خاں ممبر راجیہ سبھا کے یہاں قیام کیا، وہاں سے مولانا کو فون کیا تو انہوں نے فرمایا کل کہیں اور کا پروگرام نہ بنانا میں ۱۰۔۱۱ بجے کے درمیان مسعود صاحب کے یہاں آکر تمہیں لے لوں گا اور اپنے آفس ریل بھون لے جاؤں گا، ایک مرتبہ وہ جعفر شریف صاحب سے ملانے کے لئے مجھے ان کے بنگلے پر بھی لے گئے۔

جعفر شریف صاحب اعظم گڈھ میں بڑی لائن کے افتتاح کی تقریب میں یہاں آئے تو جمعہ کا دن تھا انہوں نے اطلاع کی کہ وہ شبلی منزل میں قیام کریں گے اور جمعہ کی نماز اس کی مسجد میں پڑھیں گے، مولانا بھی ان کے ہم راہ تشریف لائے تھے اور انکار کے باوجود ہم لوگوں کے اصرار پر نماز جمعہ پڑھائی، ایک مرتبہ چندر جیت یادو کی انتخابی مہم کے دوران بھی وہ جمعہ کے روز مجھ سے ملنے شبلی منزل آئے، اور الکشن اور دوسرے موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے اور جمعہ کی اذان کو جب چند منٹ رہ گئے تو جانے لگے میں نے کہا ابھی آپ کو دو کام کرنے ہیں (۱) جمعہ پڑھانا اور (۲) ماحضر تناول فرمانا، فرمانے لگے مسافر پر جمعہ نہیں اور آپ کے ناشتے سے دوسرا کام بھی ہو گیا۔

مولانا بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، ان کی ساری زندگی قومی وسیاسی جھمیلوں میں گزری لیکن اپنی قلندرانہ شان ہمیشہ باقی رکھی اور سیاست کی کثافت اور سیاسی زندگی کی آلائش سے ان کا دامن آلودہ نہیں ہوا، ان کا شمار ملک کے مشہور قائدین میں ہوتا تھا مگر وہ اپنی عظمت اور بڑائی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے، نہایت خلیق ومتواضع، وضعدار اور شریف انسان تھے، بڑے تپاک اور خندہ

پیشانی سے ملتے تھے اور بلا اختلاف مذہب وملت ہر ایک کا کام کرتے تھے۔ اگر کوئی مصیبت زدہ شخص کوئی کام لے کر ان کے پاس آجاتا تو وہ جس حال میں بھی ہوتے اس کا کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے اور اپنی بیماری اور تکلیف کی پروانہ کرتے مظلوموں کی دادرسی اپنا فرض سمجھتے اور اس کے لئے فساد زدہ جگہ اور کرفیوزدہ علاقے میں بے خوف وخطر پہنچ جاتے۔ مسلمانوں کو درپیش موجودہ مشکلات و مسائل سے بے چین اور بے قرار رہتے اور ان کے حل کے لئے برابر فکر مند رہتے، غیظ وغضب کے موقع پر بھی وہ مشتعل نہیں ہوتے، اپنے مخالفین کے خلاف ناروا الفاظ ان کے منہ سے نہ نکلتے، جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہوتا ان کے بھی درپے آزار نہ ہوتے۔ ان کی وفات قوم وملت کا بڑا حادثہ ہے اللہ تعالیٰ اس کی تلافی فرمائے اور مولانا کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے اعزہ کو صبر وسکون عطا کرے۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ۵ بجے شام کراچی میں وفات پائی، وہ اردو کے مشہور ادیب، محقق، صحافی اور شاعر تھے، پاکستان جانے سے پہلے وہ ”ادارۂ ادبیات اردو“ حیدرآباد کے تمام کاموں میں پیش پیش اور ادارے کے رواح رواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری کے دست راست رہے، عرصے تک ماہ نامہ ”سب رس“ کے مدیر بھی رہے۔

مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں میں اردو کے استاد کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں، اردو میں انھوں نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں ”ارمغان امجد“، ”مثنوی تصویر جاناں“ مصنفہ لچھمی نرائن شفیق ”اردو میں سائنسی ادب“، ”رسالہ محمود خوش دہاں“ اور ”حیدرآباد کے شاعر“ قابل ذکر ہیں، ۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی دس سالہ سرگرمیوں کی مبسوط تاریخ ”سرگذشت ادارہ“ کے نام سے مرتب کی تھی جو وہاں سے شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ رسالوں میں ادبی وتحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے، شاعر بھی تھے لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو ان کے دل ودماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اپنے مکان کا نام ”ایوان اردو“ رکھا اور کراچی سے ماہنامہ ”سب رس“ جاری کیا اور اس کا ”زور نمبر“ نکالا، حیدرآباد کی طرح کراچی میں بھی وہ اردو کی خدمت اور فروغ کے لئے سرگرم عمل

رہے، بہادر یار جنگ اکیڈمی سے بھی تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ اردو زبان وادب کے اس مخلص خادم کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعزہ واقربا کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

الحاج عبدالقیوم

۱۵/ نومبر ۲۰۰۱ء کو الحاج عبدالقیوم صاحب کا انتقال ہوگیا، وہ کلکتہ کے ایک مشہور ہوٹل کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت کے ساتھ، قوم وملت کا درد، دین داری اور ہر طبقے میں مقبولیت عطا کی تھی، کلکتہ ہی نہیں ملک کے بھی علمی وتعلیمی اداروں کو ان سے بڑا فیض پہنچتا تھا۔

یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کے عرصے تک صدر رہے، اس زمانے میں یتیموں کی پرورش اور کفالت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، اسلامیہ ہسپتال کے بھی برسوں صدر رہے، کلکتہ کے مسلمانوں کے سب سے قدیم ادارہ انجمن مفید الاسلام کے اصل کرتا دھرتا جناب سید محمد صلاح الدین صاحب تھے جو جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے حقیقی چچا تھے، ان کے کلکتہ چھوڑنے کے بعد انجمن کے حالات درہم برہم ہوئے تو الحاج عبدالقیوم صاحب نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے رفیق الحاج غلام رسول صاحب کی معاونت سے اس کے حالات درست کئے، وہ ۱۹۹۲ء تک انجمن کے صدر رہے اور اپنے بعد کلکتہ کے ایک مقبول اور ہر دل عزیز شخص جسٹس خواجہ محمد یوسف کو انجمن کا صدر بنوایا۔

ہندوستان کے جن علمی وتعلیمی اداروں سے ان کا زیادہ تعلق تھا ان میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلما خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب کے وہ بڑے قدرداں تھے اور ندوۃ المصنفین کی اعانت اور سرپرستی فرماتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلما کی بھی امداد فرماتے، دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم بھی الحاج عبدالقیوم صاحب کے بڑے مداح تھے اور کلکتہ تشریف لے جاتے تو جن لوگوں سے التزاماً ملاقات کرتے ان میں یہ اور حاجی غلام رسول مرحوم بھی تھے۔

عبدالقیوم صاحب اہل علم کے بڑے قدرداں تھے، علما اور دانش وروں کی بڑی خاطر مدارات اور مہمان نوازی کرتے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کلکتہ تشریف لے جاتے تو الحاج عبدالقیوم صاحب ان کی ضیافت کا خاص اہتمام کرتے، خواجہ یوسف صاحب سے ان کے بہت

مخلصانہ تعلقات تھے وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو ان کے اعزاز میں بڑا پر تکلف عشائیہ دیا۔ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے وہ لائف ممبر تھے اور اس کے ہر ہر پروگرام میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ان کو اچھا علمی ذوق اور شعر وسخن سے مناسبت تھی۔ انگریزی سے بھی اچھی واقفیت تھی، اخبار اور رسالے ان کے مطالعے میں رہتے، علمی ذوق ہی کی بنا پر ان کے پاس کتابوں کا بھی اچھا ذخیرہ ہو گیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان میں جنگ چھڑی تو حکومت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا، اس وقت بنگال میں پی۔ سی۔ سین کی حکومت تھی اس نے کلکتہ کے خاص طور پر سربرآوردہ مسلمانوں پر بڑا قہر ڈھایا۔ الحاج عبدالقیوم صاحب بھی اس موقع پر گرفتار کر لیے گئے تھے، ان کی وفات سے کلکتہ ایک مقبول، مخیر، دین دار اور علم وادب نواز شخص سے محروم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

عبدالمجیب سہالوی

افسوس ہے کہ ۲ر نومبر ۲۰۰۱ء کو مشہور مزاحیہ نگار اور صحافی عبدالمجیب سہالوی کا انتقال ہو گیا، ان کا وطن ضلع بارہ بنکی کا قصبہ سہالی تھا جو درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین کا وطن ہونے کی بنا پر عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ مرحوم عبدالمجیب سہالوی کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی پھر انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری لی مگر صحافت کے پیشہ سے وابستہ رہے۔

ان کو ادب کی مخصوص صنف طنز ومزاح سے دلچسپی تھی، ایک زمانے میں لکھنؤ سے نکلنے والا مشہور روزنامہ قومی آواز پورے اتر پردیش میں چھایا ہوا تھا، مگر پچھلے کئی برسوں سے وہ یہاں سے تو غائب ہو گیا مگر اس کو اور اس کے فکاہی کالم ''گلوریاں'' کو ابھی تک لوگ بھولے نہیں ہیں۔ یہ کالم سہالوی صاحب ہی لکھتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کو بڑی شہرت ملی۔ لکھنؤ کی شستہ وشیریں زبان اور طنز ومزاح کا کالم سونے پر سہاگا ہوتا تھا۔

ان کے دلچسپ فکاہی مضامین کا ایک مجموعہ ''مفلسی میں آٹا گیلا'' کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ انہوں نے طویل عمر پائی لیکن عرصے سے ان کا نام سننے میں نہیں آرہا تھا گویا موتوا قبل ان تموتوا کی تفسیر ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ ادب وصحافت کے اس خادم کی مغفرت

فرمائے اور پس ماندگان کو تسلی عطا کرے۔ آمین۔

''ض''

ڈاکٹر خورشید احمد فارق

از پروفیسر مختار الدین احمد ★

دوشنبہ، ۱۸ر شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ مطابق ۵ر نومبر ۲۰۰۱ء کی صبح کو عربی زبان وادب کے استاد، تاریخ اسلام کے ماہر اور ممتاز مصنف ڈاکٹر خورشید احمد فارق کوئی ۸۵ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد دہلی میں وفات پاگئے۔

وہ ۱۹۱۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی وعربی کی متداول کتابیں انھوں نے گھر پر اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ کالج کی تعلیم انھوں نے بریلی میں حاصل کی۔ ام۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ ریسرچ کے دوران وہ شعبہ عربی میں کچھ کلاسیں بھی لیتے رہے۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں وہ اینگلو عربک کالج دہلی میں لکچرر، ۱۹۵۳ء کے اواخر میں دہلی یونیورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کے ایک وظیفے پر ایک سال کے لئے وہ مصر گئے۔ وہاں دار الکتب المصریہ کے مخطوطات کے مطالعے کا انھیں اچھا موقع ملا۔ ریاض الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور عبدالحلیم ندوی صاحب کو بھی اسی سال یہ وظیفہ ملا تھا۔ قاہرہ میں ان تینوں کا خوب ساتھ رہا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں وہ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں وہ متقاعد ہو کر علی گڑھ آگئے اور سرسید نگر میں اپنے تعمیر کردہ مکان ''بانس کلی'' میں مقیم ہو کر علمی وادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ آخر عمر میں وہ اپنے بچوں کے پاس دہلی چلے گئے تھے، وہیں ان کی وفات ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

ڈاکٹر فارق نے اردو، انگریزی اور عربی میں عربی اور تاریخ اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں اور کثرت سے مضامین سپرد قلم کیے جو زیادہ تر رسالہ ''برہان'' دہلی میں شائع ہوئے۔

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

★ سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی۔ ناظمہ منزل، ۴/۲۸۶ امیر نشاں روڈ، علی گڑھ

قاضی شریح اور دیگر مضامین (دہلی ۱۹۵۵ء)، حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط (دہلی ۱۹۶۰ء)، حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط (دہلی ۱۹۵۹ء)، تاریخ ہند پر نئی روشنی (دہلی ۱۹۶۰ء)، تاریخ ردّہ، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں (دہلی ۱۹۶۲ء)، قرنِ اول کا ایک مدبّر (دہلی ۱۹۶۱)، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ (دہلی ۱۹۷۷ء) تاریخ اسلام (خلافت راشدہ، بنی امیہ) مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی، جائزے (تاریخی، تمدنی، جغرافیائی، قانونی، ادبی، نحوی) حصۂ اول (علی گڑھ ۱۹۸۷ء)، جائزے (تاریخی، تمدنی، اقتصادی، جغرافیائی، ادبی) حصۂ دوم (علی گڑھ ۱۹۸۴ء) بعد کو اس کتاب کے مزید حصے شائع ہوئے۔ یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔

عربی میں ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں: تاریخ الردّہ مقتبس از کتاب الاکتفاء مصنفۂ الکلاعی البلنسی (دہلی ۱۹۷۰ء)، الرسائل الرسمیۃ لعمر بن الخطاب، اور کتاب المنمق لابن حبیب البغدادی (دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۶۴)

زیاد بن ابیہ (بمبئی ۱۹۶۶ء)، تاریخ ادب عربی (دہلی ۱۹۷۸ء)، ایک عرب سیاسی شاطر کی کہانی (دہلی ۱۹۶۷) انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔

خورشید احمد فارق صاحب کو میں نے پہلی بار اکتوبر ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں دیکھا۔ ''سیدنا'' ملا طاہر سیف الدین (۱۸۸۴۔۱۹۶۵) کے بنوائے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرے میں جو سر سید ویسٹ سے ملحق ہے اور جس میں اس زمانے میں شعبۂ عربی تھا، انھیں اکثر کلاسیں لیتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ اور ڈاکٹر سید محمد یوسف دونوں جو علامہ عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸۔۱۹۷۸ء) کے شاگرد تھے، بی۔اے کی کلاسیں لیتے تھے اس لیے مجھے ان کی کلاسوں میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ میری کلاسیں مولانا بدرالدین علوی (۱۸۹۳۔۱۹۷۵ء) لیتے تھے۔ خوب یاد ہے وہ ابن درید (متوفی ۳۲۱ھ) کی کتاب المجتنیٰ پڑھاتے تھے۔

مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی کے عزیز ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری میرے ہوسٹل کے وارڈن تھے۔ ان سے ملنے ڈاکٹر محمد یوسف برابر آتے تھے میری ان سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی لیکن فارق صاحب سے برسوں ملنا نہ ہو سکا۔ وہ بہت کم آمیز تھے۔ گفتگو میں خود پہل نہیں کرتے تھے، کسی نے کچھ پوچھا تو آنکھیں بند کر کے دو ایک جملے میں جواب دے دیا اور پھر خاموش ہو گئے۔ ایک آدھ بار شعبے میں ان کے پاس حاضر ہوا، کلاس میں فارغ تنہا بیٹھے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ علی گڑھ آنے سے پہلے

پٹنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ زیاد بن ابیہ پر کام کر رہے ہیں۔ خاموش رہے۔ نہ یہ پوچھا کس نے کہا اور نہ کسی قسم کی خوشی یا دلچسپی کا انھوں نے اظہار کیا۔ میں ایک آدھ بات کر کے اُٹھ آیا۔ ان سے ملاقاتیں کئی سال کے بعد ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئیں جب میں ایم۔اے کا طالب علم تھا۔ سر سیدؒ کے ایک قرابت مند ڈاکٹر سید عابد احمد علی جنھوں نے آکسفرڈ سے پروفیسر مارگولیتھ کی نگرانی میں مشہور نحوی عالم ابن السکیت (۱۸۶ھ۔ ۲۴۴ھ) کی ''اصلاح المنطق'' اڈٹ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی، ایم۔اے کی کلاس لیتے تھے۔ ان کے ذمہ تنقید اور تاریخ اسلام کا پرچہ تھا۔ سید صاحب تعطیلاتِ گرما میں لاہور گئے تو تقسیم ہند کے شاخسانے میں مہینوں وہیں رک گئے۔ یہاں تعلیم کا نقصان ہونے لگا تو میمن صاحب نے خورشید احمد فارق صاحب کو علی گڑھ آنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ وہاں دہلی یونیورسٹی میں نہیں اینگلو عربک کالج میں ملازم تھے۔ وہ اپنی مادر درسگاہ کی خدمت پر آمادہ ہو گئے اور ہم لوگوں (مسعود صدیقی (بھوپال)، حافظ خورشید حسین (سنبھل) اور راقم الحروف) کو تنقید کا پرچہ پڑھانے لگے۔ جو ڈاکٹر عابد احمد علی پڑھایا کرتے تھے۔ عابد علی صاحب کے ذمے تاریخ اسلام کا پرچہ بھی تھا۔ مورخ اسلامی (محمد بن عفیفی الباجوری الخضری) کی تاریخ الامم الاسلامیۃ کورس میں تھی، میمن صاحب نے فیصلہ سنایا کہ اسے کسی استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنے کی ضرورت نہیں، اسے آپ لوگ خود تیار کریں۔ اسے ہم لوگوں نے خود پڑھا اور شاید سب سے زیادہ نمبر اسی میں حاصل کیے۔ تنقید کے پرچے میں فارق صاحب پھر ''نقد النثر'' پڑھانے لگے جو اس وقت تک قدامہ بن جعفر الکاتب البغدادی (م ۳۳۷ھ) کی تصنیف سمجھی جاتی تھی (نقد الشعر قدامہ کی تصنیف تھی تو یہ فرض کر لیا گیا کہ ''نقد النثر'' بھی اسی کی لکھی ہوئی ہوگی) بعد کو ڈاکٹر طہ حسین نے اس خیال کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اس کا اصل مصنف قدامہ بن جعفر نہیں (۱)۔ فارق صاحب اسے تنقید کی کتاب کے طور پر نہیں، عہد عباسی کی قدیم عربی نثر کی تصنیف کی حیثیت سے بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں عربی بھی انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی اور طالب علموں کو جواب بھی انگریزی میں دینا ہوتا تھا اس لیے شاگرد اور استاد دونوں کو خاصی محنت کرنی

(۱) نقد الشعر قدامہ بن جعفر بغدادی کی مشہور کتاب ہے اور نقد النثر عربی کی Prose Criticism کی کتاب ہے جو کورس میں رہی ہے، یہ بھی ایک زمانے تک قدامہ کی تصنیف سمجھی جاتی رہی، ڈاکٹر طہٰ حسین نے ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ اور الاستاذ المغنی نے کچھ پہلے قدامہ کی طرف اس کتاب کی نسبت مشکوک ٹھہرائی۔ ایک عرصے کے بعد ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے یہ کتاب چسٹر بیٹی کے کتب خانے (ڈبلن۔ آئرلینڈ) میں دریافت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کا اصل نام **البرھان فی وجوہ البیان** ہے اور اس کے مصنف ابوالحسین اسحاق بن ابراہیم بن وہب الکاتب ہیں۔

ہوتی تھی۔ میں نے فارق صاحب کو با اصول، ایماندار اور محنتی پایا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مقرر وقت میں کتاب ختم نہیں ہوسکتی تو انھوں نے سہ پہر کو بھی اپنی قیام گاہ پر بلاکر پڑھانا شروع کیا۔ وہ اس زمانے میں محمودہ بیگم (اہلیہ جسٹس سید محمود مرحوم) کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ روزانہ شام کی چائے ہمارے لیے باہر بھجوادیتی تھیں۔ یاد نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب ہماری چائے میں شریک ہوتے تھے یا نہیں۔ غالباً اسے مضرِ صحت سمجھ کر شریک نہیں ہوتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے چائے مُدِر ہے اور جو چیز مُدِر ہے وہ مضر ہے۔ اب وہ ظروف یاد نہیں کہ سیشن کے اختتام کے بعد وہ کیوں دہلی واپس چلے گئے۔

استاد فقید علامہ عبدالعزیز میمن ایڈورڈ کالج پیشاور، اورینٹل کالج لاہور میں برسوں استاد رہے پھر ۱۹۲۵ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۷۔ ۱۹۳۰) کے عہد میں وہ علی گڑھ آئے۔ کوئی پچیس سال وہ یہاں درس دیتے رہے۔ پھر برسوں وہ کراچی اور پنجاب کی جامعات کے عربی کے شعبے میں بحیثیت پروفیسر کے کام کرتے رہے، لیکن اس پورے عرصے میں ان کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والے ان کے صرف تین شاگرد ہیں جنھوں نے اپنا کام مکمل کرکے ڈاکٹریٹ حاصل کی اور یہ تینوں علی گڑھ کے ہیں۔

سرفہرست ڈاکٹر سید محمد یوسف (۱۹۱۶۔ ۱۹۷۸ء) ہیں، میمن صاحب کے بہترین شاگرد جو اپنے استاد سے بے حد محبت کرتے تھے اور استاد بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ یوسف صاحب نے تاریخ اسلام کے ممتاز جنرل مہلّب بن ابی صفرۃ الأزدی پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی، ان کے ممتحن ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰۔ ۱۹۴۹ء) صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی تھے۔ جنھوں نے اس مقالے کی بہت تعریف کی تھی۔ افسوس ہے ایسا قابل قدر مقالہ آج تک شائع نہ ہوسکا۔ صرف اسکے چند ابواب "اسلامک کلچر" حیدرآباد میں شائع ہوئے تھے۔ مقالہ نہ علی گڑھ میں محفوظ ہے نہ ان کی بیگم صاحبہ کے پاس کراچی میں۔ یوسف صاحب علی گڑھ، قاہرہ اور سیلون کی جامعات میں برسوں درس دیتے رہے۔ پھر کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے جہاں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے متقاعد ہوئے۔ وہ متعدد عربی و اردو کتابوں کے مصنف ہیں۔ میرے خیال میں ان کا سب سے اہم علمی کام خالدی برادران (ابوعثمان سعید الخالدی (متوفی ۳۵۰ تقریباً) اور

ابوبکر محمد الخالدی (م ۳۸۰ھ) کی الأشباہ والنظائر (حماسۃ الخالدیین) اور ابومحمد الحسن بن عبداللہ بن سعید العسکری (۲۹۳۔ ۳۸۲ھ) کی کتاب التصحیف والتحریف کی تصحیح وتہذیب ہے۔ یہ کتابیں علی الترتیب قاہرہ اور دمشق سے شائع ہوئی ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد ڈاکٹر خورشید احمد فارق (۱۹۱۶۔ ۲۰۰۱ء) ہیں جو آج موضوع سخن ہیں۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے ایک بطل جلیل عراق کے گورنر زیاد بن اَبیہ (م ۵۳ھ) پر علمی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ یہ مقالہ The story of an Arab Diplomat کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ فارق صاحب جیسا کہ لکھا جاچکا دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر تھے۔ ان کی تصانیف کی فہرست اوپر درج ہوئی۔

میمن صاحب کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والا تیسرا شاگرد راقم الحروف ہے جس نے تاریخ اسلام کے بجائے عربی ادب کے کسی موضوع پر ریسرچ کرنے پر اصرار کیا جس پر استاذ مرحوم نے صدرالدین علی بن ابی الحسن بن ابی الفرج البصری (م ۶۵۶ھ) کی "الحماسۃ البصریۃ) کی تصحیح وتحشیے کا کام اس کے سپرد کیا۔ اسے ۱۹۵۲ میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ مقالے کے ممتحن مشہور جرمن مستشرق پروفیسر فریتس کرینکو (۱۸۷۶۔ ۱۹۵۲) مقیم کیمبریج تھے۔ اسے دو جلدوں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے ۱۹۶۵ میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بیروت سے ۱۹۷۵ کے لگ بھگ نکلا ہے۔ راقم جنوری ۱۹۵۳ میں شعبۂ عربی میں لکچرر، ۱۹۵۸ میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر اور ۱۹۶۸ میں پروفیسر عبدالعلیم (۱۹۰۵۔ ۱۹۷۶) کے وائس چانسلر ہونے پر ادارے کا ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ اسی سال شعبۂ عربی میں پروفیسر شپ اور شعبے کی صدارت تفویض ہوئی۔ ۱۹۸۴ میں سبکدوش ہوا۔ یونیورسٹی نے مزید چار سال کے لیے ملازمت میں توسیع دی جواب تک صرف پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر ہادی حسن کو ملی تھی۔

ڈاکٹر خورشید فارق نے طویل عمر پائی۔ ان کی پوری زندگی درس وتدریس اور تالیف وتصنیف میں گزری۔ انھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی صاحبزادی عربی میں ام۔ اے ہیں۔ دہلی میں حکومت کے ایک ادارے میں عربی پڑھاتی ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے ڈاکٹر رفیع العماد فینان اور احمد فرحان ہیں۔ ڈاکٹر رفیع العماد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر ہیں اور صاحبِ تصانیف ہیں۔ خدا ان سبھوں کو خوش وخرم رکھے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ دے۔

مطبوعات جدیدہ

سیرۃ ابن اسحاق   تحقیق و تعلیق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مترجم جناب نور الٰہی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۹۵، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: سینٹر کلچرل اسلامک، ۵-۶-۱۰۱۷۵، آغا پورہ، حیدرآباد-۱

سیرت طیبہ کے خزانۂ کتب میں امام محمد بن اسحاق کی کتاب سیرت المبتدا والمبعث و المغازی کی اولیت و اہمیت محتاج بیان نہیں، ابن ہشام نے دراصل اسی کو حذف و اضافہ کے بعد مرتب کیا تو یہ سیرت ابن ہشام کے نام سے مرجع انام ہوئی، اس شہرت و مرجعیت میں اصل کتاب غفلت و عدم اعتنار کی وجہ سے ثانوی ہوکر رہ گئی اور آہستہ آہستہ اس کے نسخے کتب خانوں سے معدوم ہوتے گئے، مراکش کی ایک دور افتادہ بستی فاس کے کتب خانہ قروین میں اس گمشدہ خزانہ کا علم جب اس کتاب کے فاضل محقق کو ہوا تو انہوں نے تعلیق و تحقیق کے اعلیٰ معیار کے ساتھ علمی دنیا کے سامنے اس کو پیش کر دیا، کتاب میں ان کا محاکمہ ان کے علم و تحقیق کا بہترین نمونہ ہے، مترجم نے اصل عربی کتاب کو خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے، ایک اور خوبی ڈاکٹر عبدالرحمن مومن کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے فاضل محقق کو آیۃ من آیات اللہ سے بجا طور پر تعبیر کیا ہے۔

حیات ابوالمآثر   از جناب ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۷، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مرقاۃ العلوم، پوسٹ بکس نمبر ۱ مئو۔ یوپی۔

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ اس دور میں علم حدیث خصوصاً فن اسماء الرجال

میں نمونہ سلف تھے، وہ مدۃ العمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف رہے، کچھ دنوں عملی سیاست سے بھی ان کا سروکار رہا، لیکن ان کی اصل شہرت علم حدیث سے بے مثال شغف و اشتغال کے سبب ہے، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، المطالب العالیہ، مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور جیسی امہات کتب کی تحقیق و تعلیق و تحشیہ نے ان کو بقائے دوام کے دربار میں عزت بخشی، ان کی پرعظمت شخصیت ایک جامع تذکرے کی متقاضی تھی جس کو ان کے باصلاحیت نواسے نے بڑی خوبی سے انجام دے کر اردو کے سوانحی ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا، بعض اہل علم و تعلق کی تاثراتی تحریروں کے علاوہ اصل کتاب گیارہ ابواب میں منقسم ہے، گویا ایک آسمان علم و تحقیق ہستی کے یہ احد عشر کوکب ہیں، جن کی روشنی میں ان کی زندگی کے تمام پہلو روشن و تابدار نظر آتے ہیں، لائق تذکرہ نگار نے تعلق و عقیدت کے فطری جذبات کے باوجود کوشش کی ہے کہ واقعات کی ترجمانی میں اعتبار و استناد کا پایہ ساقط نہ ہو، جا بجا اردو ترجموں کے ساتھ اصل عربی عبارتوں اور مکاتیب کو من و عن نقل کرنے میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے مگر اس سے اور بعض دوسری وجہوں سے کتاب کی ضخامت اور مباحث کی طوالت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک باب میں مولانا کی عربی شاعری اور وفیات الاعیان کے تحت ان کی تحریروں کا انتخاب بھی شامل ہے، ان کی کتابوں اور مضامین و مقالات وغیرہ کا مفید اشاریہ بھی مرتب کی تلاش و محنت کا نتیجہ ہے۔

ذرا قرن اول کو آواز دینا   از جناب مولوی محمد علاء الدین ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، خوبصورت سرورق، صفحات ۳۸۴، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس ۹۳، لکھنؤ۔

اس کتاب کے لائق اور ہونہار مصنف کی دو اور کتابوں ہجرت مصطفیٰ اور منتخب تعبیرات کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، اب اس کتاب میں چند حضرات صحابہ کرامؓ کی مثالی زندگی کی موثر اور دلآویز

مرقع آرائی کی گئی ہے اور ادبی چاشنی اور سوز و مستی کی آمیزش سے واقعات کو اور پُر اثر بنانے کا اہتمام کیا گیا ہے، لیکن اس میں جا بجا آورد کا احساس ہوتا ہے، حد سے زیادہ بڑھا ہوا خطیبانہ آہنگ کبھی شور میں بھی بدل جاتا ہے۔ تاہم مصنف کا یہ جذبہ لایق قدر ہے کہ "جدید نسل کے قلب و نظر، ایمان کی روشنی اور یقین کے نور سے منور ہوں"۔ مجموعی حیثیت سے کتاب مفید اور سبق آموز ہے۔

کشکول کی منتخب کہانیاں از جناب ڈاکٹر انور حسین خاں، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: اخلاق حسین خاں، قصبہ وڈاکخانہ نیورہ، ضلع بارہ بنکی، یوپی۔

گذشتہ صدی کے نصف اول میں اودھ کے مشہور قصبہ ردولی کے چودھری محمد علی مرحوم کی تحریریں زبان کی شستگی، فکر کی رعنائی اور بیان کی لطافت کی وجہ سے اردو ادب میں منفرد اور نمایاں شان رکھتی تھیں۔ ان کے بعض ادبی مضامین کا ایک مجموعہ عرصہ ہوا کشکول محمد علی شاہ فقیر کے نام سے شایع ہوا تو اسے بڑا حسن قبول حاصل ہوا، لیکن اب وہ گویا نایاب ہے، لایق مصنف کو چودھری صاحب مرحوم سے خاص تعلق ہے۔ انہوں نے ان کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور اب انہوں نے زیر نظر کتاب میں کشکول کی چند نمائندہ کہانیوں کا انتخاب پیش کر دیا ہے، اودھ کی مخصوص قصباتی تہذیب و فضا کے علاوہ ان کہانیوں میں چودھری صاحب کے ذوق لطیف، قوت مشاہدہ اور مزاج و فکر کی شگفتگی حرف حرف سے ظاہر ہے، لائق مصنف اور ان کے استاد ڈاکٹر انیس اشفاق کے مختصر لیکن جامع مضامین نے اردو کے ایک طرحدار اور البیلے ادیب کے نام نیک کو پھر زندہ کر دیا، یہ کوشش یقیناً مستحسن ہے۔

ع۔ص۔